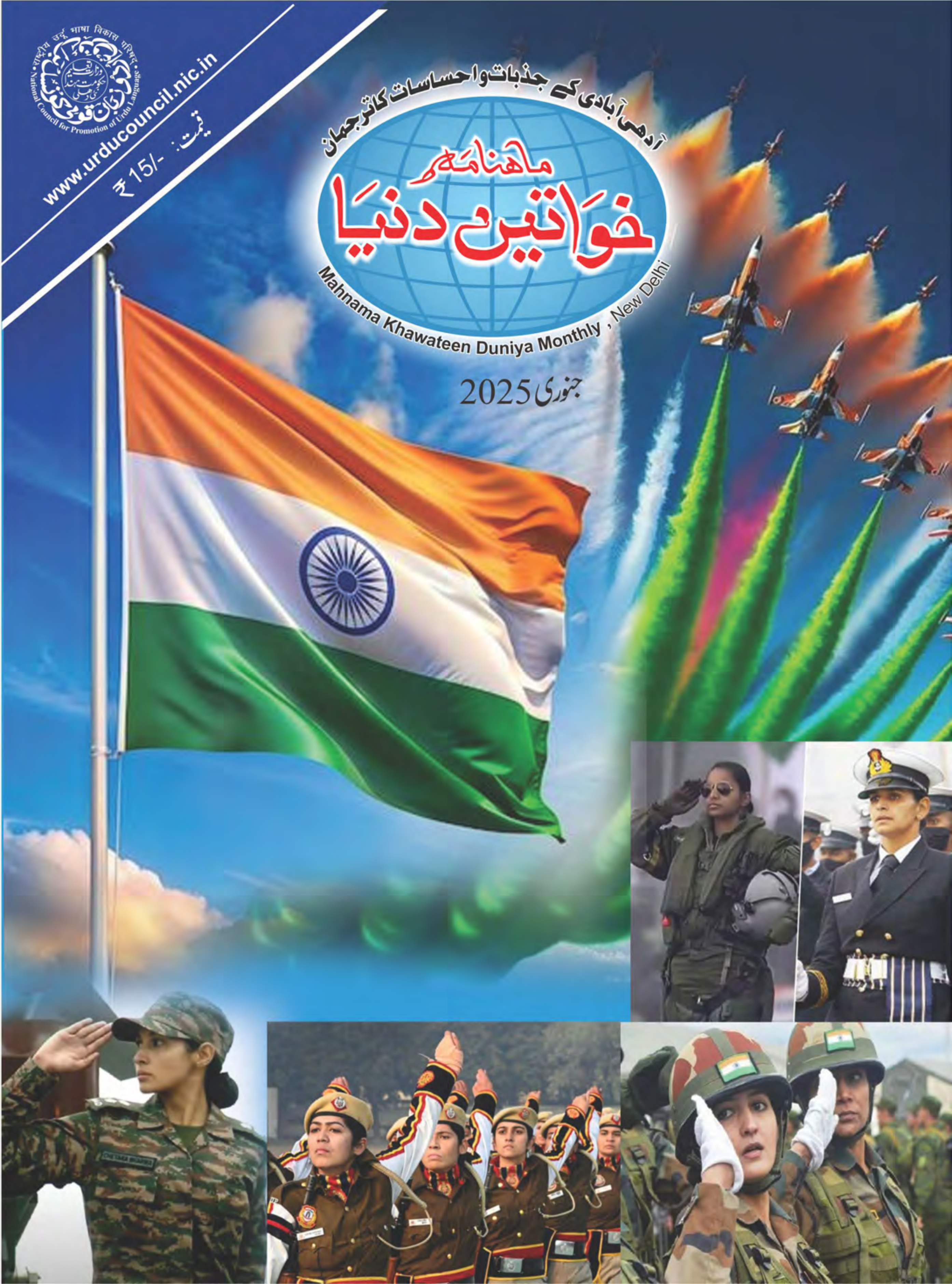

www.urducouncil.nic.in
قیمت : -/15 ₹
آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi
جنوری 2025

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اردھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 9 شمارہ: 1 جنوری 2025

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65
نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے

صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

شخصیت

صغریٰ عالم: مابعد آزادی گلبرگہ کی اولین نسائی آواز — سید عبدالحکیم — 5

جہانِ نسواں

علی برادران کی والدہ 'بی اماں' — معصوم مرادآبادی — 10

مہاراشٹر میں 1980 کے بعد ادب اطفال — حبیب النساء — 14

منٹو کے افسانے اور نسوانی کردار — قمرالنساء۔ کے — 20

بہار کے چند اہم رسائل: مختصر جائزہ — شیبا کوثر — 24

خود نوشت، سفر نامہ اور خواتین

مابعد جدید خواتین کے سفرنامے — عامر عباس — 27

سعیدہ بانو کی خودنوشت 'ڈگر سے ہٹ کر'، ایک مطالعہ — عنب شمیم — 32

نگار خانہ افسانہ و شعر

اردو ادب کی اہم خواتین افسانہ نگار — محمد ارشد — 37

آزادی کے بعد ہندوستانی نسائی شاعری کے موضوعات — حنا آفریں — 42

خواتین اور سماج

سماج کے مختلف شعبوں میں خواتین کی حصے داری — نیلوفر فردوس — 47

حسن سخن

جوہی بیگم شاما، فرزانہ پروین — 52

افسانہ

واردات — سحر اسعد — 53

صحت

خواتین کی صحت مند زندگی کے لیے غذا کی اہمیت — سعدیہ زاہد — 56

ارتباط

مباحثہ/ قارئین کے خطوط — 61

مشعل

حقوق نسواں آج کے عہد کا ایک اہم مسئلہ ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ خواتین کو اولاً وہ تمام حقوق عطا کیے جائیں جو بطور انسان کسی کو عطا کیے جاتے ہیں۔اس ذیل میں سماجی اور معاشرتی سطح پر برابری اصل چیز ہے۔اس کے تحت خواتین کو معاشی طور پہ پرقوت بنایا جائے ،حکومت اور سماج کے اداروں میں ان کی نمائندگی یقینی ہو،قانونی سطح پر جو حقوق مردوں کو حاصل ہیں وہ حقوق انھیں بھی دیا جائے۔اس کے علاوہ سماجی اور معاشرتی سطح پر کسی بھی طرح کے جسمانی اور ذہنی استحصال سے انھیں محفوظ رکھنے پر توجہ بے حد ضروری ہے۔اگر خواتین ہمارے معاشرے میں محفوظ نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا معاشرہ بھی محفوظ نہیں۔ہماری تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی حفاظت حقوق نسواں کے تحفظ کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی۔ایک زمانے تک خواتین کو ان حقوق سے محروم رکھا گیا اور کسی نہ کسی طور پر ان کا استحصال کیا گیا۔پھر ایک زمانے تک حقوق نسواں کے تحت ان حقوق کے مطالبے کیے جاتے رہے۔دنیا میں بہت سے ممالک ہیں جہاں خواتین کو سماجی اور قانونی سطح پر تحفظ حاصل ہے اور مردوں کی طرح خواتین کو بھی مساوی حقوق دیے گئے ہیں۔لیکن بعض ممالک ایسے بھی ہیں جہاں خواتین کے بعض یا بیشتر حقوق آج بھی نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

ہندوستانی دستور نے ایک طرف جہاں مردوں کو حقوق دیے ہیں وہی خواتین کو بھی مساوی حقوق عطا کیے ہیں۔ہندوستانی دستور میں اس بات کی پوری وضاحت ہے کہ ہندوستانی شہریوں کے ساتھ جنس،نسل،زبان،مذہب،رنگ اور علاقے کی سطح پر کسی طرح کا امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ہندوستانی دستور میں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ اس میں بچوں کے ساتھ خواتین کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ان کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے خصوصی تجاویز تیار کرنے کا ضابطہ پیش کیا گیا ہے۔جنسی سطح پر خواتین کے ساتھ جو امتیازات برتے جاتے ہیں ہمارے دستور نے اس کی شدید مخالفت کی ہے اور خواتین کو اس سطح پر محفوظ کیا ہے۔روزگار میں خواتین کو مواقع عطا کرنے اور خصوصی طور پر حکومتی اداروں میں ان کی تقرری کے سلسلے میں مردوں کے بالمقابل یکساں مواقع فراہم کرنے کا حکم دیا ہے۔خواتین کو معاشی تعاون و تحفظ کے تحت دستور نے میٹرنٹی Maternity ریلیف دی،پنچایت اور میونسپلٹی کی ایک تہائی سیٹوں کو ان کے لیے مخصوص کیا،ہندوستانی انتخابات میں مردوں کے ساتھ انھیں بھی رائے دہی کے حقوق عطا کیے اور ان کی عزت واحترام اور وقار کو یقینی بنایا۔غرض ان نکات پر غور وخوض کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کے تحفظ حقوق کے سلسلے میں تمام ممکنہ مسائل کو دور کرنے میں ہندوستانی دستور نے اہم رول ادا کیا ہے۔

عزت مآب صدر جمہوریہ محترمہ دروپدی مرمو نے بہ موقع یوم تاسیس،قومی کمیشن برائے خواتین میں 31 جنوری 2023 کو یہ بات کہی کہ 'خواتین کو بااختیار بنائے بغیر مضبوط اور صحت مند معاشرے کا تصور بھی ممکن نہیں۔خواتین کو بااختیار بنانا صرف سماجی انصاف کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ معاشی ترقی کے لیے بھی اہم ہے'۔لہذا ضروری ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں خواتین کی شمولیت کو یقینی بنایا جائے۔انھیں زندگی کے مختلف شعبوں میں بااختیار بنانے کے لیے اقدام کیے جائیں۔کونسل بھی اس سلسلے میں مستقل کوششیں کررہی ہے۔ہماری میگزین خواتین دنیا انہی کوششوں کا ایک اہم حصہ ہے۔ہم نے خواتین کے موجودہ مسائل کے تحت مذکورہ میگزین میں مباحثے کا بھی آغاز کیا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اس مباحثے میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوں۔اس حوالے سے جن مسائل وموضوعات پر گفتگو ضروری ہے،ان کی نشاندہی بھی کریں۔

آپ کا

شمس اقبال

سید عبدالحکیم

صغریٰ عالم

مابعد آزادی گلبرگہ کی اولین نسائی آواز

صغریٰ عالم (2011-1938) آزادی کے بعد پہلی خاتون شاعرہ تھیں جن کے آٹھ شعری مجموعے اور چار نثر پر مشتمل کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ سنہ 1990 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ ان کے انتقال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''حیطۂ صدف'' (1990)، ''بیت الحروف'' (1995)، ''صفِ ریحان'' (1997)، ''محرابِ دعا'' (1999)، ''قوسِ قزح'' (2004)، ''حنا غزل'' (2005)، ''نشاطِ معنیٰ'' (2007)، ''بابِ جبریل'' (2009) شامل ہیں۔

آزادی کے بعد خواتین نے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مشرق میں خواتین نے مردوں کے بعد لکھنا شروع کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستانی سماج میں اردو شعروادب سے دلچسپی صرف مردوں ہی تک محدود تھی۔ مذہبی خیالات، توہم پرستی اور تعلیم کے فقدان کے باعث خواتین کے لیے معاشرے کے حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ اس کوچے میں وہ قدم رکھ سکیں۔ رفتہ رفتہ معاشرے میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ سیاسی، اصلاحی تحریکیوں اور جدید تعلیمی نظام نے معاشرتی منظرنامے کو بدل کر رکھ دیا۔ شہر گلبرگہ تاریخی، تہذیبی اور ادبی لحاظ سے اہم مقام رکھتا ہے۔ اس شہر سے کئی قدآور شخصیات ابھری ہیں جنھوں نے اپنی ادبی کارگزاریوں سے شہرت دوام حاصل کیا۔ اس علاقے کی خواتین قلم کار کس طرح پیچھے رہتیں۔ چنانچہ گلبرگہ کی شعری روایت اور اس سے وابستہ خاتون قلم کاروں میں پہلی صاحب کتاب شاعرہ کے طور پر صغریٰ عالم کا نام لیا جاسکتا ہے، جنھوں نے بیک وقت درس وتدریس اور ادبی وشعری خدمات انجام دیتے ہوئے اپنا اور اپنے علاقے کا نام روشن کیا۔

انھوں نے شعری ادب کے ساتھ ساتھ نثری ادب میں بھی اضافے کیے ہیں۔ابتدا میں انھوں نے احمد جلیس کی ایما پر ایک افسانہ لکھا جو آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ سے نشر ہوا۔اسی دوران شعری ونثری کتابوں پر تبصراتی اور تنقیدی مضامین بھی لکھتی رہیں۔ان مضامین کو ''کفِ میزان'' کے نام سے شائع بھی کروایا۔صغری عالم کا ادبی سرمایہ تنقیدی وتحقیقی تصنیف کے علاوہ ان پر لکھے گئے تبصرے،مضامین اور خطوط ا بھی شامل ہیں۔ان کی نثری نگارشات میں پروفیسر عنوان چشتی: محقق، ناقد اور شاعر (تحقیق)2002 کفِ میزان (تبصرے و مضامین)2004،نامے جو میرے نام آئے (2004)،ابرِ نیساں(2006) شامل ہیں۔ان کی نثری خدمات کے حوالے سے ڈاکٹر صبیحہ تحسین لکھتی ہیں:

> ''صغریٰ عالم ایک محقق اور ناقد کی حیثیت سے بھی جانی جاتی ہیں۔گلبرگہ میں علم عروض کے حوالے سے بھی آپ کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔بحیثیت محققہ بھی صغریٰ عالم نے نہایت عمدہ کام کیا ہے۔انھوں نے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ''عنوان چشتی، محقق، ناقد اور شاعر' کے نام سے ترتیب دیا ہے جسے 2002 میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا گیا ہے۔اس مقالے میں انھوں نے عنوان چشتی کی شخصیت اور کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کا یہ تحقیقی مقالہ معلومات افزا مفید اور دلچسپ ہے اور ادبی تحقیق وتنقید کی عمدہ مثال بھی۔
>
> صغریٰ عالم کی دوسری کاوش 'کفِ میزان'' کے نام سے منظر عام پر آئی جس میں محترمہ نے اپنے ہم عصر قلم کاروں پر تحقیقی وتنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔اس کتاب میں مختلف ادبا اور شعرا اور ان کے ادبی کارناموں پر اپنی نقد و بصر سے کام لیتے ہوئے ان کے محاسن و معائب پیش کرتے ہوئے متوازن تنقید کی روش ڈالی ہے۔بہر حال انھوں نے بحیثیت محقق اور ناقد عمدہ کام کیا ہے۔''1

صغریٰ عالم کی نظمیں،غزلیں اور مضامین اردو کے معروف اخبارات، رسائل اور جرائد کی زینت بھی بن چکی ہیں۔آپ کا کلام ملک کے نامور روزناموں ہفت روزہ اور ماہناموں کے علاوہ مجلّات میں بھی شائع ہوتا رہا ہے۔انشا (کلکتہ)،شاعر (ممبئی)،انجمن (گلبرگہ)، خوشبو کا سفر (حیدرآباد)، کتاب نما اور آجکل (دہلی) وغیرہ شامل ہیں۔رسائل وجرائد اور اخبارات کے علاوہ ان کا کلام ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی نشر و اشاعت سے مزین ہوتا رہا ہے۔صغریٰ عالم نے اپنی تخلیقات کو شائع کرنے کے لیے اخبارات، رسائل اور جرائد کے علاوہ کتابیں بھی شائع کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔لہٰذا ان کے آٹھ شعری مجموعے اور چار نثر کی کتابیں میری بات کی دلالت کرتی ہیں۔ان کی تخلیقات اور کتابوں پر اہلِ علم نے خوب پذیرائی بھی کی اور اس پر کئی انعامات واعزازات سے بھی سرفراز کیا گیا۔

''اردو کی اس با کمال شاعرہ نے جہاں علمی اور ادبی سطح پر ناقابل فراموش کام کیاوہیں عملی طور پر بھی انھوں نے گلبرگہ میں اردو کی ترقی اور بقاکا کام انجام دیا۔ مختلف انجمنوں سے ان کی وابستگی رہی اور کرناٹک اردو اکیڈمی کے رکن کی حیثیت سے بھی اپنا خاص رول ادا کیا۔اس کے علاوہ کئی شعری و ادبی نشستوں کی روح رواں بن کر بھی ادب کی اشاعت و فروغ میں پیش پیش رہیں۔ بحیثیت شاعرہ ریاستی اور قومی مشاعروں میں شرکت فرماکر گلبر گہ کے نام کو نمایاں کیا۔صغری عالم کی پیدائش1938 کی ہے۔ زندگی کی (73) بہاریں دیکھ کر اس عالم آب و گل سے 20/ مارچ 2011 بروز جمعہ اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔''

اردو کی اس با کمال شاعرہ نے جہاں علمی اور ادبی سطح پر ناقابلِ فراموش کام کیا وہیں عملی طور پر بھی انھوں نے گلبرگہ میں اردو کی ترقی اور بقا کا کام انجام دیا۔مختلف انجمنوں سے ان کی وابستگی رہی اور کرناٹک اردو اکیڈمی کے رکن کی حیثیت سے بھی اپنا خاص رول ادا کیا۔اس کے علاوہ کئی شعری وادبی نشستوں کی روح رواں بن کر بھی ادب کی اشاعت

وفروغ میں پیش پیش رہیں۔ بحیثیت شاعرہ ریاستی اور قومی مشاعروں میں شرکت فرما کر گلبرگہ کے نام کو نمایاں کیا۔ صغری عالم کی پیدائش 1938 کی ہے۔ زندگی کی (73) بہاریں دیکھ کر اس عالم آب وگل سے 20/ مارچ 2011 بروز جمعہ اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔

صغری عالم تقدیسی شاعری میں بھی انفرادیت رکھتی ہیں۔ ان کے یہاں حمدیہ، نعتیہ اور منقبتیہ اظہار بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ تقدیسی شاعری میں ان کی مذہبی حسیت، خدا، رسولؐ اور بزرگوں سے محبت کا اظہار ہے۔ اس طرز کے رنگ سخن میں اخلاص اور پاکیزگی کو خاص اہمیت دیتے ہوئے انھوں نے اس بات کا پورا دھیان رکھا ہے کہ ہر مقام اور مرتبہ کا خاص خیال رکھا جائے۔ مجموعی طور پر صغری عالم کی تقدیسی شاعری جملہ آداب سے متصف نظر آتی ہے۔ ان کی تقدیسی شاعری کو فن اور فکر کا عمدہ نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کا یہ رنگ و آہنگ ایسا نگار خانہ ہے جس میں عشق حقیقی کی خوشبو قاری کے فکر ونظر کو معطر کرتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

لکھتی ہی رہوں حمد سدا خون جگر سے
کاتب بھی اگر رنگ طلائی نہیں دیتا

زمین تا فلک ہے مقام محمدؐ
ازل تا ابد ہے دوام محمدؐ

حشر تک مہکے گی خوشبو وہ گل تر ہیں حسین
خون شبیری میں پنہاں زینتِ اسلام ہے

صغریٰ عالم کی نظموں میں بھی عصری رنگ واثر پایا جاتا ہے قابل ذکر نظمیں جیسے ماں کا تصور، کربلا میں وفا، سال نو، سلامتی کا نشان، ہمارا دل، زبان اردو اور نہیں مرتی ہے کوئی ماں وغیرہ میں حزن اور افسردگی کا احساس اور فکر کے دائرے ملتے ہیں۔ شاعرہ کے یہاں کچھ پالینے کی شدید خواہش ہے اور وہ پرامید بھی ہے مگر وہ امیدیں ادھوری ہی رہیں۔ یہ تاثر ان کی متعدد نظموں کے مطالعے سے ابھرتا ہے۔

خیال آتا ہے کہ جمہوریت کے خوابوں کا
سنہرا خواب
جو نیندوں کو تازگی بخش
یقین کے نور سے تعبیر جن کو مل جائے
کہ آدھی رات کو کوئی نہ اٹھ کے گھبرائے
کھلی سڑک پہ یہ آدم گزیدہ لوگ نہ ہوں
کسی بھی سمت سے ابھرے نہ تیرگی کوئی
حیات وممات میں پیہم نہ کشمکش ہو کوئی
خیال آتا ہے...... پناہ سب کو ملے گی حصار شہر میں اب
گلی گلی میں محبت کی بولیاں ہوں گی
ہر ایک موڑ پہ چاہت کے مورچے ہوں گے
مٹھاس شہد کی ہوگئی ہر ایک محبت میں/ خیال آتا ہے......

(نظم: خواب جمہور۔ص33۔31)

"صغریٰ عالم گلبرگہ کے شعری منظر نامے کی ایک کہنہ مشق شاعرہ رہی ہیں جنھوں نے جذبات و احساسات سے پر شاعری کی ہے۔ بقول شاعرہ پیار اور محبت، درد اور کرب ان کی شاعری میں منعکس ہیں۔ ان کے پاس الفاظ پر کھنے اور ان کو نگینے بنانے کا ہنر ہے۔ اس لیے ان کی شاعری حسن کا مرقع بن گئی ہے اور قاری کو احساس جمال کا ذائقہ دے گئی۔ انہوں نے غزل کے لطف کو برقرار رکھا ہے۔ الفاظ کی شائستگی اور لطافت ان کی غزل کا وصف ہیں۔ صغریٰ عالم نے اپنے عہد کی سماجی اور معاشرتی فکر و نظر کو اجاگر کیا ہے"

صغریٰ عالم کی شاعری میں زندگی کے مثبت پہلو جابجا نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈھنگ سے شعر کہے ہیں چونکہ شعر کہنا ایک تخلیقی عمل ہے۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ اسی سبب شاعری میں غنائیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان کے استعارات وعلامات اور الفاظ کا دائرہ بھی محدود ہے۔ لفظیات کے معاملے میں بھی ان کا رویہ تقلیدی یا

روایتی رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود خواتین شعرا میں ان کی اہمیت اور انفرادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شبنم گھورکھپوری لکھتے ہیں:

''شاعرہ کے احساس سے ٹپکی ہوئی خون کی بوندیں شعر کا لباس پہن کر نہ صرف ماحول کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ اس کی تاریکیوں میں اخوت ومحبت کی قندیل جلاتی ہیں۔ صغریٰ عالم کی شاعری ہنگاموں کا ذکر تو کرتی ہے، لیکن ان کے نازک احساسات کی وجہ سے کلام میں کوئی شوروغل نہیں ہوتا بلکہ ایک لطیف سی سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ شاعرہ کا بیدار ذہن جب چمن میں شوروں کی بھنک پاتا ہے تو وہ آنے والے حادثوں کو بھانپ لیتا ہے۔ شاعرہ کا عزم بے درد ساحلوں سے ٹکرانا بھی جانتا ہے اور طوفانی اضطراب کے پیچ وتاب سے گزرتا بھی۔''2

صغریٰ عالم گلبرگہ کے شعری منظر نامے کی ایک کہنہ مشق شاعرہ رہی ہیں جنھوں نے جذبات واحساسات سے پر شاعری کی ہے۔ بقول شاعرہ پیار اور محبت، درد اور کرب ان کی شاعری میں منعکس ہیں۔ ان کے پاس الفاظ پرکھنے اور ان کو نگینے بنانے کا ہنر ہے۔ اس لیے ان کی شاعری حسن کا مرقع بن گئی ہے اور قاری کو احساس جمال کا ذائقہ دے گئی۔ انھوں نے غزل کے لطف کو برقرار رکھا ہے۔ الفاظ کی شائستگی اور لطافت ان کی غزل کا وصف ہیں۔ صغریٰ عالم نے اپنے عہد کی سماجی اور معاشرتی فکرونظر کو اجاگر کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہو:

بجھائی جائے نہ یہ روشنی محبت کی
کہ دوریوں میں بھی یادوں کو ضوفشاں کرلیں

صغریٰ ہجوم شہر میں چہرے خزاں زدہ
پہچان کے وہ موسم شاداب کیا ہوئے

صغریٰ عالم کا اسلوب اور لفظیات بھی مخصوص ہیں، ان کی شاعری میں کلاسیکی لفظیات اور علائم سے شعری فضا پیدا کرتی ہیں۔ اگر چہ صغریٰ عالم کی شاعری میں بے تکلفی کا احساس قاری کے لیے الجھن پیدا کرتا ہے، تاہم ان کی شاعری ابہام یا گنجلک نہیں ہے۔ صغریٰ عالم نے روایتی شاعری کے ذریعے اپنے فن کے سفر کو آگے بڑھایا۔ وقت کے ساتھ ان کی شاعری میں عصری حسیت در آئی۔

غزل میں جب بات تغزل کی آتی ہے تو عموماً شعرا دو طرح کی باتوں کو بیان کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ محبوب کے خدوخال اور دوسرے راہ عشق کی تکلیفات یعنی آپ بیتی۔ یہ دونوں وصف صغریٰ عالم کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

رخصت کرو اور آنکھ سے آنسو بھی پونچھ لو
میں پھر ملوںگی تم کو ثوابوں کے درمیاں

صغریٰ عالم اپنے دور کی ایک باکمال شاعرہ رہی ہیں جن کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے۔ بحیثیت خاتون انھوں نے نہ صرف نسائی احساسات کی ترجمانی کی ہے بلکہ اپنی شاعری کو اپنے تجربات سے مالا مال کیا ہے۔ یہی ان کی عصری حسیت اور عصری آگہی کا کمال بھی ہے۔

''ان کی غزل میں روایتی عناصر کے ساتھ ساتھ شعری تحریکات و رجحانات کے عناصر بھی بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ بالخصوص ترقی پسندی اور جدید عناصر ان کے یہاں ملتے ہیں۔ اس لیے وہ عہد دو ہزارہ کی کامیاب شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنے عصر کے حالات کو محسوس کیا پھر اس احساس کو شعری جامہ پہنایا۔ انھوں نے اپنے عہد کے مختلف النوع کیف یات کو اپنے مخصوص رنگ سخن میں پیش کیا ہے اور عقل و شعور سے کام لے کر غزل کو جاذبیت عطا کی ہے یہی ان کے فن کا کمال ہے۔ شاعرہ نے عصری حقائق کی فراہمی کے تجربے سے اپنی غزل کو جدید اور عصری حسیت سے آمیز کیا۔ ان کی غزلیں سماج و معاشرے کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔''

ان کی غزل میں روایتی عناصر کے ساتھ ساتھ شعری تحریکات

ورجحانات کے عناصر بھی بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ بالخصوص ترقی پسندی اور جدید عناصر ان کے یہاں ملتے ہیں۔اس لیے وہ عہد دو ہزارہ کی کامیاب شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنے عصر کے حالات کو محسوس کیا پھر اس احساس کو شعری جامہ پہنایا۔انھوں نے اپنے عہد کے مختلف النوع کیفیات کو اپنے مخصوص رنگ سخن میں پیش کیا ہے اور عقل وشعور سے کام لے کر غزل کو جاذبیت عطا کی ہے یہی ان کے فن کا کمال ہے۔شاعرہ نے عصری حقائق کی فراہمی کے تجربے سے اپنی غزل کو جدید اور عصری حسیت سے آمیز کیا۔ان کی غزلیں سماج و معاشرے کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔

شہروں میں امارات کی بہتات ہوئی ہے
مفلس ہی ہیں ہند کے دہقان ہمارے

صغریٰ عالم کی غزل میں موضوعی لحاظ سے وسعت پائی جاتی ہے۔ان کی غزل میں عشقیہ جذبات کے علاوہ وقت اور حالات کی کربناکی بھی ہے۔ان کے یہاں مختلف موضوعات ملتے ہیں جو ان کی غزل کو وسعت اور تازگی بخشتے ہیں۔صغریٰ عالم کے فکروفن کا نگارخانہ ہمہ جہت اور رنگا رنگ ہے انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صغریٰ عالم کی شعری اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کرناٹک کی سرزمین کو اپنی جن خاتون شاعروں پر ناز رہے گا ان میں ایک صغریٰ عالم بھی ہیں۔صغریٰ عالم خاموشی سے شعروادب کی دنیا میں آئیں اور جلد ہی ایک عالم کو فتح کرلیا۔وہ تو خیر نظمیں بھی کہتی ہیں لیکن ان کا فن نکھرتا ہے غزلوں میں۔وہ مثبت فکر اور مقصدی شاعری کی قائل ہیں۔ان کی شاعری شاعری نہیں ان کی زندگی ہے۔انھوں نے زندگی کے اپنے تاثرات، مشاہدات اور تجربات کو گویا منظوم کردیا ہے۔ان کے اشعار معاشرتی اختلال وانتشار اور عصری درد و کرب کے مرقع ہیں۔حقیقت پسندانہ رویہ اور تکلف برطرف والا لہجہ صغریٰ عالم کی شناخت ہے۔کہیں کہیں نسائی جذبات کی ترجمانی بھی۔''3

صغریٰ عالم شعری خدمات اور ان کے مجموعوں کا مطالعہ اس بات کا شاہد ہے کہ ان کے یہاں غزلیہ شاعری کا حصہ غالب نظر آتا ہے۔ان کی غزلیہ شاعری روایتی عناصر کے ساتھ ساتھ جدید نسائی حسیت سے مملو نظر آتی ہے۔ان کی غزلیں کچھ ذات سے متعلق ہیں اور کچھ تجربات کا حصہ ہیں۔ان تجربات میں ان کی رنگارنگ کیفیات اور متنوع جذبات کی نمائندگی ہوتی ہے۔عہد حاضر میں کسی بھی شاعر کی انفرادی شناخت ایک بہت مشکل امر ہے مگر شاعر کے تجربات و مشاہدات جداگانہ نوعیت کے ہوتے ہیں اور پھر اسلوب اور ڈکشن بھی اس شاعر کی انفرادی حیثیت متعین کرنے میں معاون و مددگار ہے۔ صغریٰ عالم کے یہاں یہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔صغریٰ عالم نے تقدیسی شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔تقدیسی شاعری میں انھوں نے بالخصوص نعتیہ شاعری میں عقیدت، سنجیدگی، اور عشق رسول کا برملا اظہار کیا ہے۔ان کی نظمیہ شاعری میں شدت تاثر کی تپش محسوس کی جاسکتی ہے۔انھوں نے بیان کی ندرت اور پیکر سازی کے ذریعے تخلیقی فضا پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔غرض ان کا اولین شعری مجموعہ ''حیطۂ صدف'' کی شاعری جذبوں کو گویائی دینے والی شاعری ہے۔ان کے یہاں غزل کا بانکپن بھی ہے، نظم کا آہنگ بھی اور نعت کا تقدس بھی۔ان کا اپنا انفرادی اسلوب اور لفظیاتی نظام ہے۔

حوالے

1 ڈاکٹر صغریٰ عالم: حیات اور ادبی خدمات (غیر مطبوعہ)، ڈاکٹر صبیحہ تحسین، ص360)
2 مطبوعہ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی، ۱۴ راکتوبر1991)
3 کرناٹک میں اردو شاعری (آزادی کے بعد)، مرتبہ مجلس اشاعت انجمن ترقی اردو، گلبرگہ، ص64)

□□□

Dr. Syed Abdul Hakeem
C/o Shanawaz T.V Cable Office
Tope Galli, Near SVP Chowk
Karanaaka State
Humnabad, Distt.Bidar-585330 (K.S)
Email :tabishbinsagar@yahoo.com
Mob: 09141130203

معصوم مرادآبادی

علی برادران کی والدہ

بی اماں

جنگ آزادی کے عظیم سپاہی علی برادران (مولانا محمد علی وشوکت علی) کی والدہ بی اماں کے انتقال کو صدی بیت گئی۔ انھوں نے 13 نومبر 1924 کو اسی دہلی میں وفات پائی اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئیں۔ ان کی خوبی صرف یہی نہیں تھی کہ انھوں نے اپنے بطن سے ایسے جیالے پیدا کئے بلکہ وہ خود بھی تحریک آزادی کا ایک مضبوط ستون تھیں۔ اپنی آخری عمر میں جبکہ ان کے دونوں بیٹے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کررہے تھے تو وہ خود تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں اور ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی روح پھونک رہی تھیں۔ وہ برقع پہن کر خواتین کے اجتماعات کو خطاب کرتیں اور ان سے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے میدان میں آنے کا مطالبہ کرتیں۔ عدم تعاون کی تحریک کے دوران انھوں نے بھاگلپور اور پٹنہ کا دورہ کیا اور فروری 1922 میں دربھنگہ سے خلافت کمیٹی کے لیے ساٹھ ہزار کا چندہ جمع کیا، جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی۔ ان کی پوری زندگی آزادی کی جدوجہد میں گزری۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں پنڈت ڈاکٹر بھگوان داس نے ''بھارت ماتا'' کے خطاب سے نوازا تھا۔ افسوس کہ ہم نے جنگ آزادی کے دیگر سپاہیوں کی طرح بی اماں کو بھی فراموش کردیا۔ آزادی کی جدوجہد میں ان کے لافانی جذبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار علی برادران جیل میں تھے تو کسی نے یہ افواہ اڑادی کہ ان کے دونوں بیٹے انگریزوں سے معافی مانگنے پر تیار ہوگئے ہیں تو کہلا بھیجا ''دیکھو میں بوڑھی ہوگئی ہوں، لیکن اگر تم نے معافی مانگنے کا ارادہ کیا تو ابھی میرے ہاتھوں میں اتنی جان ہے کہ دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔'' مولانا محمد علی جوہر کے آخری دور کے ساتھی مولانا عبدالملک جامعی نے بی اماں کے بارے میں لکھا ہے:

> ''شیروں کی ماں تھی، شیرنی تھی۔ دونوں بھائیوں کو دین کی حمیت اور غیرت ماں ہی سے ملی تھی اور ملی قربانیوں کا سبق بھی۔ محمد علی کا ددھیال تو انگریزوں کے وفاداروں میں تھا، مگر بی اماں کے گھر میں ایک دن میں سونتھنیاں اتاری گئی تھیں، غدر میں شہید ہونے والے شوہروں کی بنا پر۔''1

بی اماں کا خاندان 1857 کی جنگ آزادی میں پیش پیش تھا اور ان کے خاندان کے سیکڑوں لوگوں نے اس میں جام شہادت نوش

کیا تھا۔خود بی اماں کے والد نے بھی شہادت پائی ۔جب ان کے والد کوانگریزوں نے سزائے موت دی تو بی اماں کی عمر محض پانچ سال تھی ۔اتنی کم عمری میں انھیں یتیمی کا غم برداشت کرنا پڑا۔بی اماں کا اصل نام عبادی بانو بیگم تھا۔ان کی پیدائش مغربی اتر پردیش کے مردم خیز خطہ امروہہ میں1852 میں ہوئی ۔ان کے والد امروہہ سے بسلسلہ ملازمت رامپور منتقل ہو گئے تھے۔رامپور میں ہی ان کی شادی ہوئی ۔شادی سے قبل وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھیں،لیکن ان کے شوہر عبدالعلی خاں ایک تعلیم یافتہ شخص تھے اور ریاست رامپور میں ملازم تھے۔انھیں اردو، فارسی ،عربی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ان کی صحبت میں بی اماں کو پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا اور انھوں نے شوہر کی زندگی میں ہی اردو سیکھ لی۔شوہر کی وفات کے بعد انھوں نے باقاعدہ اردو سیکھی اور پھر جلسوں میں یوں تقریریں کرنے لگیں کہ کوئی یقین ہی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ بیس سال کی عمر تک اَن پڑھ تھیں۔مولانا محمدعلی کا بیان ہے کہ ’’میری والدہ عملی طور پر بالکل ان پڑھ تھیں مگر مجھے زندگی میں جن لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا،ان میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں ملا جوان سے زیادہ صاحب فہم ہو۔‘‘ محمدعلی یہ بھی کہتے تھے کہ وہ ’’جو کچھ بھی ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ خداوند کریم نے انھیں ان کی والدہ کے ذریعہ پہنچایا تھا۔‘‘

یادش بخیر!یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔عمر یونہی کوئی سولہ سترہ برس تھی۔ میرے ماموں مولانا عبدالملک جامعی ، مدینہ منورہ سے دہلی تشریف لائے۔ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتے تو مجھے ساتھ لے لیتے ۔ایک روز انھوں نے پرانی دہلی میں درگاہ شاہ ابوالخیر کا رخ کیا اور وہاں معروف عالم دین مولانا زید ابوالحسن فاروقی سے ملاقات کی ،جو اس درگاہ کے سجادہ نشین بھی تھے۔وقت رخصت مولانا فاروقی انھیں ایک قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے لے گئے، جو درگاہ کے احاطہ میں ایک کونے میں واقع تھی۔اس قبر کے آثار بہت نمایاں نہیں تھے،مگر جب یہ معلوم ہوا کہ یہ جنگ آزادی کے عظیم مجاہدین علی برادران کی والدہ بی اماں کی قبر ہے تو اس میں میری دلچسپی میں اضافہ ہو گیا۔ حالانکہ یہ وہ دور تھا جب میں تحریک آزادی کی تاریخ اور اس کے ہیروز سے زیادہ واقف نہیں تھا۔اپنے ماموں کے ساتھ میں نے بھی بی اماں کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے آپ کو بتاتا چلوں کہ میرے ماموں مولانا عبدالملک جامعی ،جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں تھے۔انھوں نے1929 میں وہاں داخلہ لیا۔یہ وہ دور تھا جب جامعہ قرول باغ میں ہوا کرتی تھی۔اسی زمانے میں وہ مولانا محمدعلی جوہر کے رابطے میں آئے جو اس وقت شیخ الجامعہ تھے۔یہ مولانا محمدعلی جوہر کا آخری دور تھا۔ اسی زمانے یعنی1929 اور 1930 میں میرے ماموں ٔمولانا محمدعلی جوہر کے خادم کے طور پر ان سے قریب رہے۔اس دور کی یادوں پر مشتمل ان کی کتاب ’’مولانا محمدعلی جوہر:آنکھوں دیکھی باتیں‘‘ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔میری خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کتاب کی ترتیب وتدوین کا کام میں نے کیا اور یہ مولانا جامعی کے انتقال کے تیس برس بعد2020 میں شائع ہوکر منظر عام پر آئی ۔اپنے اوریجنل مواد کی وجہ سے اس کتاب کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔اس کتاب میں بی اماں کا تذکرہ کثرت سے موجود ہے۔

بی اماں کی شادی رامپور کے ایک معزز خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے شوہر عبدالعلی خاں بھی سرفروشانہ جذبات کے حامل تھے۔بی اماں کی عمر ابھی28 برس ہی تھی کہ ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا ۔انھوں نے اپنی بیوگی پر ماتم کرنے کی بجائے اپنی پوری توانائی اور توجہ بچوں کی تعلیم وتربیت پر مرکوز کردی۔ان کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔والد کے انتقال کے وقت مولانا محمدعلی ڈھائی سال کے اور مولانا شوکت علی تقریباً پانچ برس کے تھے۔انھوں نے نہایت محدود اور مشکل حالات میں بچوں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیا۔

بی اماں آزادی کی جدوجہد میں شامل ہونے والی پہلی مسلم خاتون تھیں۔انھوں نے بھارت چھوڑ وتحریک اور تحریک خلافت کے دوران بیگم حسرت موہانی ،سرلا دیوی ،بسنتی دیوی ،مس اینی بیسنٹ اور سروجنی نائیڈو کے شانہ بشانہ جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ وہ کھادی پہنتی تھیں اور اپنی تقریروں میں دیگر خواتین سے بھی کھادی پہننے کا مطالبہ کرتی تھیں ۔1919 میں جبکہ خلافت تحریک اپنے شباب پرتھی تو انھوں نے برقع پہن کر مسلم لیگ کے اجلاس کو خطاب کیا۔تحریک

خلافت کے دوران جب علی برادران گاندھی جی کے ساتھ جیل میں تھے تو بی اماں نے پورے ملک کا دورہ کرکے اس تحریک میں جان پھونکی۔

مولانا محمد علی جوہر نے اپنی زندگی کے پچاس سال کی تکمیل پر ''ہمدرد'' میں اپنی والدہ کے بارے میں تحریر کیا تھا:

''17 ررمضان المبارک 1297 کو میرے والد نے بعارضہ ہیضہ کوئی تیس بتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت میری والدہ مرحومہ کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔ سوائے قرآن پاک کے کچھ نہ پڑھا تھا۔ اس کی مدد سے خود اردو کا بین السطور ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کرلی تھی۔ والد نے تیس پینتیس ہزار قرضہ چھوڑا تھا اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی جن میں سب سے بڑے کی عمر 13 سال کی تھی جو تین برس ہی کی عمر میں مرگی کے موذی مرض میں مبتلا رہے اور سب سے چھوٹا میں خود تھا جس کی عمر پونے دو سال کی تھی۔ مجھے اپنے والد مرحوم بالکل یاد نہیں مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا، علاوہ اس فیض گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت نگرانی اور ترغیب وتحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوا۔ میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اسی مرحومہ کے ذریعہ سے پہنچایا ہے۔''2

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں ان کی والدہ بی اماں کا کتنا اہم اور بنیادی کردار تھا۔ انھوں نے سب سے بڑا سبق جو علی برادران کو دیا، وہ جرأت اور بے باکی کا سبق تھا۔ وہ خود بھی انتہائی بہادر اور جری خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کی طرح اپنی زندگی بھی ملک کی آزادی کے لیے وقف کردی تھی اور وہ اس کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتی تھیں۔ جب دونوں بھائی جیل میں تھے تو 7 ستمبر 1917 کو ڈی ایس پی عبدالمجید علی برادران سے ایک معاہدہ کرنے چھندواڑہ جیل پہنچے ہوئے تھے۔ بی اماں کو جیسے ہی خبر ملی وہ فوراً نقاب ڈال کر اس کمرے میں پہنچ گئیں جہاں عبدالمجید بیٹھے تھے اور چلاّ چلاّ کر کہنے لگیں:

''میں یہ چاہتی ہوں کہ گورنمنٹ یہ جان لے کہ اپنی تکالیف سے بچنے کے لیے وہ (علی برادران) کسی ایسی بات کا اقرار کرلیں گے جو ان کے مذہبی احکام یا ملکی فوائد کے ذرا بھی خلاف ہو تو مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک میرے قلب کو اتنی مضبوطی اور ان سوکھی جھریاں پڑے ہاتھوں میں اتنی طاقت دے گا کہ میں اسی وقت ان کا گلا گھونٹ دوں گی۔ گو یہ مجھے عزیز ہیں اور کریم شمیم دکھائی دیتے ہیں۔''3

بلاشبہ علی برادران ایسی غیور، باکردار اور وطن پر جان نچھاور کرنے والی ماں کی آغوش میں پلے بڑھے تھے کہ وہ انگریزوں سے محض کوئی معاہدہ کرنے کے اندیشے سے دونوں کا گلا گھونٹنے پر آمادہ ہوگئی تھیں۔ بی اماں نے عین جوانی میں اپنے شوہر کے انتقال کے بعد جو مجاہدانہ زندگی بسر کی، اس کے حوالے سے مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہیں:

''والد مرحوم کی وفات کے دن سے خود گھر کی بوڑھی ماؤں کا سا سادہ سستا لباس پہنا اور ان ہی کی طرح روکھی سوکھی کھا کر بسر کی مگر ہمارا کوئی سوال رد نہیں کیا اور ہمیں اس عیش وآرام میں رکھا، پالا اور بڑا کیا جو ہمارے ان چچاؤں کی اولاد کے عیش وآرام سے کسی طرح کم نہیں تھا مگر کچھ زائد ہی تھا' جو بفضلہ تعالیٰ والد مرحوم کی وفات کے وقت زندہ اور سلامت تھے، جن کی جائیدادوں پر قرضوں کا وہ بوجھ نہ تھا، جو ہمارے ترکہ پر تھا اور جو ریاست رامپور میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ ان میں سب سے پہلے ہمیں کو گھر سے نکال کر بریلی اسکول میں تعلیم کے لیے والدہ مرحومہ نے بھیجا اور وہ سب تو اسکول چھوڑ کر چلے گئے مگر ہماری تعلیم جاری رہی اور شوکت صاحب جس طرح ریاست رامپور کے باشندوں میں سے غالباً سب سے پہلے کسی ہندوستانی یونیورسٹی کے گریجویٹ ہوئے، اسی طرح میں ان میں سب سے پہلے آکسفورڈ یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوا۔''4

مولانا محمد علی جوہر نے 1902 میں انگلینڈ کا سفر کیا اور آکسفورڈ میں سول سروس کے امتحان میں بیٹھے، لیکن شومیٔ قسمت اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس ناکامی کی خبر ''پایونیر'' اخبار میں شائع ہوئی تو ان کے بڑے بھائی شوکت علی بہت مایوس ہوئے کیونکہ ان ہی کی کوششوں سے مولانا محمد علی کے انگلینڈ جانے کا انتظام ہوا تھا۔ اس پر بی اماں نے پیش قدمی کی اور انھیں مایوسی سے نکالا۔ اس واقعہ کو مولانا

محمد علی نے یوں بیان کیا ہے۔

''ایک غریب بھائی کی بے نظیر اور حیرت انگیز ہمت کی بدولت یکا یک آکسفورڈ جانے کا انتظام ہوا تھا جب کہ سول سروس میں ناکام رہ چکا تھا۔ شوکت صاحب بھی ناکامی کی خبر پڑھ کر زرد پڑ گئے تھے، مگر ایک بڑھیا نے دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا کہ کیا ہوا اور پوچھا تھا کہ 'کیا محمد علی کی امتحان میں ناکامی ہی پر اس قدر مایوس ہوتے ہو۔ اگر اس نے چوری کی ہوتی یا مرتد ہو گیا ہوتا تب تمھاری کیا حالت ہوتی۔ محمد علی کو لکھو کہ میرا اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے، اور اس کی منگیتر بھی ساڑھے تین برس سے بیٹھی ہے، اب اسے بلالو اور اس کی شادی کر دو۔ میں بلایا گیا تھا، شادی بھی ہوئی تھی۔''5

بی اماں کا اصل نام عبادی بانو بیگم تھا۔ تحریک خلافت کے میدان میں بی اماں نے جوش وخروش سے کام کیا اور اس حالت میں کہ علی برادران جیل میں بند تھے، انھوں نے سارے ہندوستان کو ترکوں کی حمایت میں اور انگریزوں کے خلاف اٹھایا۔ اس میدانی کام کے علاوہ مجالس میں ان کی سیاسی فہم اور شعور کا یہ حال تھا کہ ڈاکٹر بھگوان داس جیسے آدمی نے ان کو 'بھارت ماتا' کے خطاب سے نوازا تھا۔

13 نومبر 1924 کو دہلی میں بی اماں کا انتقال ہوا۔ پورے ملک میں تعزیتی جلسے ہوئے۔ علی گڑھ میں جلسہ ہوا جس میں سوامی ستیہ دیو نے بی اماں کی ہمت اور جرات کو داد دی اور اپنی پاٹ دار آواز میں انھیں یوں خراج عقیدت پیش کیا:

''بھائی ماتا جی تو ماتا جی ہی تھیں۔ جب ہم جوان ہمت ہار جاتے تو وہ آگے بڑھتی تھیں۔ ایک دفعہ ہم دکن میں رہ رہے تھے، ایک اسٹیشن پر لوگ ہمیں لینے آئے، ہم نے پوچھا تمہارا گاؤں کتنی دور ہے اور وہاں کیسے جاتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ گاؤں اسٹیشن سے تیس میل دور ہے، ہم لوگ پیدل یا گاڑی سے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ بھائی ہم نے تو تار دے دیا ہے اور جلسہ میں پہنچنا ہے۔ ہم تمہارے ساتھ نہیں جا سکتے۔ وہ ترش رو ہو کر جانے لگے۔ ماتا جی کو پتہ لگا تو لوگوں کو بلایا اور کہا 'بیٹا تمہارے ساتھ میں چلوں گی۔ موٹروں میں تو سبھی جاتے ہیں، بیل گاڑی میں، میں جاؤں گی۔' بوڑھی ماتا اتر پڑیں اور ہم جوان بھی اتر پڑے، اس طرح ماتا جی ہمیں بتا گئیں کہ کام کیسے ہوتا ہے۔ ماتا جی تو ماتا جی ہی تھیں۔''6

بی اماں نے انتقال کے بعد پرانی دہلی کی مشہور درگاہ شاہ ابوالخیر کے احاطہ میں دفن ہوئیں۔ ان کے انتقال کے بعد گاندھی جی اظہار تعزیت کے لیے ان کے گھر آئے تھے۔ بیلگاؤں کانگریس میں ان کے انتقال پر تعزیتی قرارداد منظور ہوئی تھی۔ 1990 میں پاکستان میں ان پر ایک ڈاک ٹکٹ کا اجرا عمل میں آیا۔ 28 ستمبر 2012 کو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں طالبات کے ایک ہاسٹل کو 'بی اماں' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ممتاز صحافی کلدیپ نیر نے جنگ آزادی میں بی اماں کی قربانیوں کو نئی نسل سے متعارف کرانے کے لیے انھیں نصاب میں شامل کرنے پر زور دیا تھا اور ان پر ایک کتاب لکھے جانے کی بھی وکالت کی تھی۔ حکومت ہند نے آزادی کی پچھترویں سالگرہ پر دیگر مجاہدین آزادی کے ساتھ انھیں بھی یاد کیا۔ رامپور میں ان کی یاد میں ایک گیٹ تعمیر کیا گیا ہے، لیکن اتنا کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی سرکاری ادارہ ان کی شخصیت اور کارناموں پر تمام زبانوں میں ایک کتاب تیار کروائے تاکہ ان کی یاد کو تازہ رکھا جا سکے۔

حوالے:

1 ''مولانا محمد علی جوہر: آنکھوں دیکھی باتیں'' ص24

2 بحوالہ ''مولانا محمد علی جوہر: حیات وخدمات'' مصنف صابر ارشاد عثمانی، ص81

3 رئیس احمد جعفری: ''چند اہم خطوط'' ص17

4 ''ہمدرد'' 17 جون 1927

5 بحوالہ 'مولانا محمد علی جوہر: حیات وخدمات'' صابر ارشاد عثمانی، ص92

6 ''صدق جدید'' 18 دسمبر 1964

Mr. Masoom Moradabadi
Editor : Daily Jadid Khabar
Z-103, Taj Enclave
Geeta Colony,
Delhi-110031

حبیب النساء

مہاراشٹر میں 1980 کے بعد ادب اطفال

ناول اردو ادب کی ایک اہم نثری صنف ہے۔ زندگی کی عکاسی کرنے والے مسلسل قصے یا کہانی کو ناول کہا جاتا ہے۔ ناول کی کہانی فرضی انسان کی زندگی سے متعلق فرضی واقعات کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ لیکن ان واقعات میں حیات وکائنات کی سچائیوں کا پایا جانا لازمی ہے۔ ناول داستان کی طرح طویل نہیں ہوتا ہے اس میں آسمانوں سے اترنے والی پریوں ، ہوا کے دوش پر اڑنے والے جادوئی قالینوں یا قدم قدم پر رونما ہونے والے عجیب وغریب واقعات کی گنجائش نہیں ہوتی۔

ناول ایک ایسا فن ہے جس سے بچے اور بڑے دونوں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ بچوں کے لیے لکھے گئے ناولوں میں بچوں کی نفسیات ان کے مزاج اور ان کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھا جائے۔ دوسری بات یہ کہ ناول کی زبان ، اسلوب ، طرز بیان ایسا ہو کہ بات بچوں کے دل میں اتر جائے اور لکھتے وقت ان کی صلاحیت کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ یعنی بچوں کے لیے لکھنا نہایت مشکل امر ہے۔ جہاں مختلف ناول نگاروں نے بڑوں کے لیے ناول لکھے ہیں وہیں انھوں نے بچوں کے ناول پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔

مہاراشٹر میں 1980 کے بعد بچوں کے لیے بہت سارے ناول لکھے گئے ہیں۔

آج بچوں کا ادب تخلیق کرنے والوں میں متعدد حضرات خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جن میں وکیل نجیب' ڈاکٹر بانو سرتاج' ڈاکٹر اقبال برکی' سلطان سبحانی' ایم مبین' یعقوب ابن مرتضیٰ' ایم یوسف انصاری اور ابن آدم پیش پیش ہیں۔ سرفہرست وکیل نجیب کو بلند مقام حاصل ہے۔ وکیل نجیب بچوں کے ناول نگار ہے۔ مگر موصوف کو صرف بچوں کا ناول نگار تسلیم کیا جائے تو ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی کیونکہ بڑی عمر کے لوگ بھی انھیں بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

وکیل نجیب: نام عبدالوکیل اور قلمی نام وکیل نجیب۔ یکم جولائی 1946 میں ناگپور میں پیدا ہوئے۔ ان کا ادبی سفر افسانہ نگاری سے ہوا۔ ملک کے مختلف جرائد میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ پھر انھوں نے ادب اطفال کی طرف توجہ کی۔ وکیل نجیب نے اپنی تحریروں سے بچوں کے ادب کو مالا مال کر دیا۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے بچوں کو جو پیغام دیا ہے وہ بچوں کے لیے اہم تو ہے ہی لیکن ان کی تخلیقات میں بڑوں کے لیے بھی کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہوتا

ہے۔ ادبی خدمات کے صلے میں انھیں صوبائی اور ریاستی سطح پر کئی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ انھوں نے بچوں کے لیے کل 18 ناول لکھے ہیں جن کے نام کچھ اس طرح سے ہے۔

1۔ بے زبان ساتھی 2۔ مہربان جن 3۔ خوفناک حویلی 4۔ پانچ بھائی 5۔ واپسی 6۔ انوکھی دوا 7۔ جان باز شہزادے 8۔ غدار وزیر 9۔ سازش 10۔ کمپیوٹان 11۔ ایک عجیب حادثہ 12۔ نواب بنڈی والا 13۔ انسانیت اور درندگی 14۔ خطرناک راستے 15۔ معصوم بچو کا 16۔ غمگسار 17۔ مسیحا 18۔ تلاش گمشدہ وغیرہ۔

ناول ''خوفناک حویلی'' کامیکس کی شکل میں ہے۔ وکیل نجیب کے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول کا پلاٹ بھی توہم پرستی، سائنس اور تحقیقات پر مبنی ہے۔ اس ناول میں بچوں کے مزاج کے مطابق مافوق الفطری واقعات کا ذکر دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔ ناول ''خوفناک حویلی'' واقعی خوفناک محسوس ہوتا ہے۔ ناول کے تمام واقعات ایسے ہیں جس سے قاری کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ناول نگار نے جو منظر کشی کی ہے وہ ناول کے تاثر کو دوبالا کر دیتی ہے۔ خصوصاً رات کے وقت حویلی کے ہیبت ناک منظر کو نہایت فنی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ سطور ملاحظہ فرمائیں:

''اشرف علی نے پہلے احتیاط سے چاروں طرف دیکھا انھیں آس پاس کوئی نظر نہیں آیا پھر انھوں نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور اس میں سے ایک چابی منتخب کر کے تالے کے سوراخ میں ڈالی۔ تالے میں زنگ لگ چکا تھا چابی ڈال کر انھوں نے ذرا طاقت لگائی تالا کھل گیا بس اسی وقت بڑے زور کی کھڑ کھڑاہٹ کی آواز ہوئی اور جہاں وہ کھڑے تھے اوپر سے مٹی کا ایک چھوٹا سا مٹکا بالکل اشرف علی کے سامنے آکر کھٹ سے گرا۔ کسی پرندے کی چیخنے اور پروں کو پھڑ پھڑانے کی آواز آئی چابی ان کے ہاتھ سے گر گئی اور ان کا چہرہ گرد و غبار میں اٹ گیا مٹکا زمین پر گر کر ٹوٹ گیا اس کے اندر تازہ لیموں تھا اور اس میں سوئیاں چبھی ہوئی تھی ایک کپڑے کا ٹکڑا تھا جس میں ہلدی کی گانٹھیں بندھی ہوئی تھی اور کچھ چاول کے پیلے دانے تھے۔ اس اچانک شور اور مٹکا گرنے سے اشرف علی کے ہوش اڑ گئے۔''[1]

ناول کی ابتدا میں اس بات کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ حویلی کا راز واقعی اتنا خوفناک ہوگا۔ بہر حال یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے طرز کا یہ ایک انوکھا ناول ہے۔ ناول نگار نے اس موضوع کو بخوبی نبھایا ہے۔

''پانچ بھائی'' پانچ بھائیوں کے قصے پر مشتمل ہے۔ یہ ایک تاجر اور پانچ بہادر بیٹوں کی مہم جوئی کی داستان ہے جو ماں اور باپ سے بچھڑنے کے بعد سنگین مشکلوں کا سامنا کرتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے اور اپنی بہادری اور حاضر دماغی سے ڈاکوؤں کو شکست دیتے ہیں وقت اور حالات کے ستم کے مارے ہیں اور آخر میں خاتمہ بالخیر کی طرح ان کی زندگی میں بھی سکون اور خوشیاں آتی ہیں۔ ناول میں جا بجا ایسے جاندار جملے اور مکالمے ہیں جو ناول کو پرلطف بناتے ہیں۔ ناول نگار نے کردار اور حالات کے مطابق بہترین مکالمے استعمال کیے ہیں جس سے ناول نگار کی تخیل کی گہرائی اور مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ ناول میں منظر نگاری بھی کافی خوبصورت ہے۔ سمندر اور جزیرے کے مناظر کو ناول نگار نے بہت ہی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

بہر حال یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناول بچوں کے لیے مزے کے ساتھ ساتھ معلومات اور سبق آموز بھی ہے۔ ناول کو پڑھنے کے بعد بچوں میں جوش اور بہادری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ناول نگار نے ناول کے ذریعے کئی نصیحتیں بچوں تک پہنچائی ہیں جو انھیں حوصلے اور بہادری کا سبق دیتی ہیں۔ پورا ناول پرلطف اور پراثر ہے۔

ناول ''واپسی'' جنگل کے ایک بھالو کے کردار پر مبنی ہے۔ جس کا نام بھولا ہے جو ایک ریچھ کا بچہ ہوتا ہے۔ بھولا جنگل میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ باہری دنیا اور اس کے خطروں سے بالکل بے خبر ہے۔ اس کے باپ کا نام کالو ہے۔ کالو اپنے بیٹے کو جنگل میں دور تک جانے اور اکیلے گھومنے سے منع کرتا ہے۔ کیونکہ وہ شکاری انسانوں سے واقف ہے لیکن بھولا اس بات کو نہیں سمجھتا۔ اسے اپنی طاقت اور جسمانی صحت پر غرور ہے۔ وہ شکاری کو نزدیک سے دیکھنے کے تجسس میں شکاریوں کے جال میں پھنس جاتا ہے:

''ایک آدمی نے اپنے ساتھی سے کہا اس ریچھ کے بچے کو

ہم سرکس کے مالک کو بیچ دیں گے، ہمیں کافی پیسے ملیں گے دوسرے نے کہا ہاں! سرکس کے مالک کو ایک کم عمر ریچھ کی ہی ضرورت تھی جسے وہ کرتب سکھا سکے۔''2

''انسانیت اور درندگی'' حقیقی حادثے پر مبنی وکیل نجیب کا ناول ھے۔ ناول عتیق الرحمن نام کے ایک لڑکے کے گرد گھومتا ھے ، جو مذھبی فسادات کا شکار ھے۔ عتیق جسمانی اور ذھنی طور پر ان فسادات سے متاثر ھوتا ھے۔ یہاں تک کے اس کے دماغ پر چوٹ لگنے سے ٹیومر ھوجاتا ھے۔ اس کو جا ن کا خطرہ لاحق ھوتا ھے۔ ناول کا پلاٹ مر بوط اور پر تجسس ھے۔ ناول نگار قاری کو آخر تک باندھے رکھنے میں کامیاب ھیں۔ ناول کا قصہ سچے حادثے پر مبنی ھے۔ کہانی شروع سے آخر تک پر اثر نظر آتی ھے۔ کئی سارے واقعات یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ھو تے ھیں۔ مگر پلا ٹ میں کوئی طوالت یا جھول نظر نہیں آتا ھے۔

وکیل نجیب نے اس ناولٹ میں بھالو کی بہادری کو پیش کیا ہے اور اس کے ذریعے بچوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ بڑوں کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے انسان ہو یا جانور، مصیبت و پریشانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیغام دیا ہے کہ جنگل جانوروں کی جائے پناہ ہے اور انھیں ان کے وطن سے بے دخل نہیں کرنا چاہیے۔

''انسانیت اور درندگی'' حقیقی حادثے پر مبنی وکیل نجیب کا ناول ہے۔ ناول عتیق الرحمٰن نام کے ایک لڑکے کے گرد گھومتا ہے، جو مذہبی فسادات کا شکار ہے۔ عتیق جسمانی اور ذہنی طور پر ان فسادات سے متاثر ہوتا ہے۔ یہاں تک کے اس کے دماغ پر چوٹ لگنے سے ٹیومر ہو جاتا ہے۔ اس کو جان کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ ناول کا پلاٹ مربوط اور پر تجسس ہے۔ ناول نگار قاری کو آخر تک باندھے رکھنے میں کامیاب ہیں۔ ناول کا قصہ سچے حادثے پر مبنی ہے۔ کہانی شروع سے آخر تک پر اثر نظر آتی ہے۔ کئی سارے واقعات یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مگر پلاٹ میں کوئی طوالت یا جھول نظر نہیں آتا ہے۔

ناول کے مکالمے ناول کے حساب سے موزوں ہیں۔ انھوں نے ناول کے پلاٹ کے مطابق منظر نگاری اور مکالموں سے کام لیا ہے۔ ناول میں بہت سی باتیں اسلام کے مطابق قبول نہیں کی جاسکتی۔ مگر اس کو ناول نگار کی سوچ یا ان کا نظریہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں انھوں نے غیر مسلم کردار کے خیالات اسلام کے تعلق سے پیش کیے ہیں۔ اس طرح ناول ایک بہت ہی حساس موضوع کو سماج میں پھیلانے، اس پر غور وخوص کرنے اور صحیح غلط کا فیصلہ کرنے کا موقع دیتا ہے۔

نذیر فتح پوری: مہاراشٹر کے مشہور شاعر ہیں۔ شاعر کے ساتھ ساتھ آپ ناول نگار، ڈرامہ نگار، نقاد، مضمون نگار، تبصرہ نگار، افسانہ نگار محقق اور صحافی بھی ہیں۔ نذیر فتح پوری نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی دو ناول لکھے ہیں۔ ''امیر تیمور'' اور ''امیر تیمور ہندوستان میں''۔ یہ دونوں ناول تاریخی ہیں۔ نذیر فتح پوری کی زبان آسان اور اسلوب دلکش ہے۔ نذیر فتح پوری ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں لیکن ان ناولوں کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اچھے ناول نگار بھی ہیں۔

ڈاکٹر بانو سرتاج: بانو سرتاج افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ اردو ادب کی معروف ادیبہ ہیں۔ بچوں کے ادب کے فروغ میں ان کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ بانو سرتاج نے بچوں کے لیے دو ناول لکھے ہیں۔ ''جنگل میں منگل''، ''پکیا اور پرچھم''

''جنگل میں منگل'' ڈاکٹر بانو سرتاج کا مثالی ناول ہے۔ اس ناول میں دو بچوں کی کہانی ہے جو سیلاب میں اپنے خاندان سے بچھڑ گئے ہیں۔ اس سیلاب میں ایک لڑکے کے والدین اور رشتے دار بہہ جاتے ہیں۔ اس لڑکے کو ایک آدمی پناہ دیتا ہے جسے بچہ چچا کہتا ہے اس بچہ کا ایک دوست کتا ہے جو کہیں کھو جاتا ہے۔ ناول کا پلاٹ سادہ ہے۔ چھوٹے بچوں اور جنگل کے جانوروں کے گرد گھومتا ہے۔ سیلاب کی وجہ سے اپنوں سے بچھڑے چھوٹے معصوم بچے جنگل کے جانوروں کے ساتھ اپنی چھوٹی سی دنیا بساتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد سے وہ ہر مشکل کو آسان کر لیتے ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ

بچوں کے لیے اس طرز کے ناول تخلیق کرنے کی ضرورت ہے جس میں کہانی پن ہو کرداروں میں دلچسپی اور تجسس ہو اور جن میں بچوں کو اخلاقی درس بھی دیا جائے۔

☆ **ڈاکٹر اقبال برکی:** نام اقبال احمد محمد مصطفیٰ اور قلمی نام اقبال برکی۔ ڈاکٹر اقبال برکی پیشے سے مدرس ہونے کی وجہ سے بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی کارٹونی کہانیاں اور دیگر تصانیف اخبارات اور بچوں کے رسائل کی زینت بڑھاتی ہے۔ بچوں میں ان کی کہانیاں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے بچوں کے ادب کو مالا مال کر دیا۔ ادبِ اطفال پر انھیں کئی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اقبال برکی نے بچوں کے لیے پانچ ناول لکھے ہیں جن کے نام یہ ہیں: (1) دھوئیں کا راز (2) موتی (3) شہزادے کا خواب۔ (4) استاد کی نصیحت (5) شہزادہ پرویز عالم۔

ناول ''دھوئیں کا راز'' ایک انوکھے طرز کا ناول ہے۔ بچوں کے لیے لکھے ہوئے اس ناول کے مرکزی کردار بھی بچے ہی ہیں۔ اس ناول کی کہانی بھوت، شیطان کی سنی سنائی کہانیوں سے متاثر بچوں کے گرد گھومتی ہے جو اسکول کے سائنسی ہال میں رکھے ایک پرانے استاد کے ڈھانچے کو بھوت سمجھ لیتے ہیں۔ اس کا خوف بچوں پر طاری ہو جاتا ہے۔ ناول کی کہانی چار ہم جماعت بچوں کی ہے ان میں دو لڑکیاں نوال اور شبنم ہیں اور دو لڑکے عمران اور سعید اختر۔ ان چاروں کی دوستی اٹوٹ ہے۔ اسکول کے وقت یہ چاروں دوست ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک بچہ بہادر اور نڈر ہے جو بے خوف ہو کر اس پہیلی کو حل کرتا ہے اور دھوئیں کا راز فاش کر کے دیگر بچوں کو اس خوف سے آزاد کراتا ہے۔ ناول کا پلاٹ اچھا ہے۔ تمام واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ کہانی میں بچوں میں تجسس پیدا کرنے اور اختتام تک باندھے رکھنے کا وصف ہے۔ یہ ناول بچوں میں مثبت اور تحقیقی سوچ کو بڑھاوا دیتا ہے۔

''موتی'' اقبال برکی کا فلیش بیک تکنیک پر مبنی ناول ہے۔ یہ ناول ان کے دیگر ناولوں سے تھوڑا مختلف ہے۔ اس ناول میں ایک فوجی انکل کے ذریعے ایک خوبصورت اور نئی کہانی پیش کی گئی ہے۔ ناول کا پلاٹ سادہ اور آسان ہے۔ واقعات میں تسلسل ہے۔

ناول کے کردار کافی دلچسپ اور متاثر کرنے والے ہیں۔ ایمانداری میں ایک سے بڑھ کر ایک نظر آتے ہیں۔ یہ کردار بچوں میں مثبت سوچ کو بڑھاوا دینے اور سبق دینے میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ ناول میں منظر نگاری بھی بہترین ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ناول نگار کا مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ ناول کے مکالمے بھی کہانی کے موافق ہیں۔ ناول نگار کو عربی تہذیب اور زبان و لہجہ کو بیان کرنے میں مہارت ہے۔

''شہزادے کا خواب'' ایک چھوٹا سا ناول ہے جو بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی دلچسپی اور تجسس سے بھرا ہے۔ ناول کا اہم کردار شہزادہ فیروز بخت ہے جس کے والدین کو سلطنت کے دشمن مختار ملک نے بغاوت کر کے ختم کر دیا۔ شہزادے کے والد کا نام شیر افگن ہے۔ ان کا خاص غلام ایک خواجہ سرا گلابو ہے جو بغاوت کے وقت ہوئے حملے سے شہزادے کی جان بچا کر اسے محفوظ مقام پر لے جاتا ہے۔ ناول کا پلاٹ سادہ اور مربوط ہے، تمام واقعات تسلسل سے آگے بڑھتے ہیں۔ خاص کر بچوں میں دلچسپی اور تجسس پیدا ہوتا ہے۔

سلطان سبحانی: سلطان سبحانی ممتاز افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے دو ناول لکھے ہیں۔ (1) مافوق الفطرت (2) شمائلہ

ناول ''مافوق الفطرت'' انوکھا اور دلچسپ ناول ہے۔ ناول کے تمام واقعات حقیقی دنیا سے ماورا ہیں۔ واقعی بچوں کی دنیا تصورات اور خیالات میں انوکھی ہوتی ہے جو ہم حقیقی زندگی میں پیش نہیں کر سکتے وہ خیالات میں بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ یہ ناول بھی ایسے ہی مافوق الفطری عناصر کے گرد گھومتا ہے، جسے ہماری عقل قبول نہیں کرتی لیکن تصورات اور خیالات کی دنیا میں یہ سب ممکن نظر آتا ہے۔ ناول نگار کو کردار نگاری اور مکالمہ نگاری پر بھی ناول نگار کی دسترس ہے۔

''شمائلہ'' سلطان سبحانی داستانی طرز کا ناول ہے۔ اس ناول میں مافوق الفطری عناصر جیسے جن، پری وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ یہ بچوں کے لیے ہمیشہ سے ہی تجسس اور حیرت کا باعث رہے ہیں۔ دورِ حاضر انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ آج ٹی۔ وی اور فلموں کے ذریعے

مافوق الفطری عناصر کو بھی بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ ایسے میں 'شائلہ' جیسا ناول بچوں کے لیے اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے کیونکہ جن' پریاں وغیرہ وہ ٹی۔وی پر دیکھ رہے ہیں اور ان کے تصورات میں کافی حد تک یہ شبیہہ واضح ہو چکی ہے۔ ناول کا پلاٹ مربوط ہے۔ واقعات ایک دوسرے سے اتنی خوبی سے جڑے ہیں کہ کوئی جھول پیدا نہیں ہوتا ہے۔

ایم مبین: ایم مبین بچوں کے مشہور ادیب ہیں۔ انھوں نے افسانے، ناول، ایک بابی ڈرامے جیسی اصناف میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ایم مبین کے بچوں کے لیے لکھے گئے ناولوں میں 'ٹارزن اور سرکٹی لاشیں سونے کی مورتی 'انمول ہیرا اور زحل کے قیدی' کافی مشہور ہیں۔

''ٹارزن اور سرکٹی لاشیں'' بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے بہت ہی پرتجسس اور دلچسپ ہے۔ جنگل کی زندگی، آدی باسی لوگ، ان کے طور طریقے، ان کا رہن سہن ایسی بہت سی باتیں ناول کو دلچسپ بناتی ہے۔ لطف کے ساتھ ساتھ بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملتا ہے۔ ناول کا پلاٹ بہت عمدہ ہے۔ سرکٹی لاشوں کو جاننے کا تجسس قاری کو آخر تک باندھ کر رکھتا ہے۔ تمام واقعات نہایت پراسرار طریقے سے آگے بڑھتے ہوئے ناول کو مکمل کرتے ہیں۔

یعقوب ابن مرتضیٰ: یعقوب ابن مرتضیٰ نے بچوں کے لیے دو ناول لکھے ہیں۔ (1) جنگل میں دھوم (2) بغداد کا حمال

''ناول بغداد کا حمال'' ایک مختصر ناول ہے۔ اس ناول کی زبان بہت آسان ہے۔ یہ ناول بچوں کے لیے دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ بغداد میں عبداللہ نام کا ایک شخص رہتا تھا۔ اس وقت بغداد میں خلیفہ ہارون رشید کی حکومت تھی۔ خلیفہ ہارون رشید کی حکومت میں عوام بہت خوش تھی۔ بغداد میں لوگ اپنی اپنی قابلیت کے لحاظ سے روزی کماتے اور بادشاہ سے فیض یاب ہوتے۔ لیکن ان میں عبداللہ ہی ایک ایسا شخص تھا جو بہت ہی سست، کاہل اور ان پڑھ تھا۔ اس کی بیوی محنت مزدوری کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرتی اور اپنی قسمت پر افسوس کرتی کہ کیسے آدمی سے پالا پڑا ہے؟ خلیفہ ہارون کے زمانے میں جہاں چاروں طرف خوشحالی ہی خوشحالی تھی وہاں عبداللہ بے حد دکھی تھا۔

ناول نگار نے بغداد کے شہر کے مناظر کو بخوبی واضح کیا ہے۔ کھنڈر کا نقشہ' سوکھے فوارے کا منظر اس طرح پیش کیا ہے کہ تمام مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں اور قاری کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قاہرہ شہر کا منظر بھی بہ خوبی واضح کیا گیا ہے۔ ان تمام مناظر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ناول نگار کو منظر نگاری پر بھی دسترس ہے۔ ناول کی زبان سادہ، سلیس ہے۔ قاری کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ ناول نگار کو زبان پر عبور ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یعقوب ابن مرتضیٰ نے ایک بہترین ناول تخلیق کر کے بچوں کے ادب میں اضافہ کیا ہے۔

ایم یوسف انصاری: مریخ کا حملہ ایم یوسف انصاری کا تحریر کردہ ناول ہے۔ یہ ناول دنیا میں بسنے والے انسانوں اور مریخ سے آنے والی مخلوق کے درمیان جنگ پر مبنی ہے۔ اس ناول میں مریخ سے کچھ مخلوقات زمین پر آ کر یہاں رہنے والے انسانوں کو ختم کرنا شروع کر دیتی ہیں اور ہر طرف تباہی و بربادی مچا دیتی ہیں۔

''مریخ کا حملہ'' ایک خیالی کہانی ہے۔ وہ جدید ٹیکنالوجی میں زمینی انسانوں سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور انسانوں کے بڑے آلات اور ہتھیار بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ لندن اور اس کے اطراف کے کئی دیہاتوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کا ارادہ پوری دنیا کے انسانوں کو ختم کر کے اپنی حکومت قائم کرنا ہے۔ جدید دور میں یہ ناول بچوں کی دلچسپی کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس طرح سے آنے والی نسل کو ادب سے جوڑا جا سکتا ہے۔ آج کے دور میں جن' بھوت' پریوں کی کہانیاں کوئی دلچسپی سے نہیں پڑھتا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پر مبنی کہانیاں اور ناول بچوں کے ذہن کی تعمیر میں بھی مددگار ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ناول اچھی تخلیق کہا جا سکتا ہے۔

ابنِ آدم: اردو ادب میں طلسمی ناول لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس حوالے سے ابن آدم کا نام سرفہرست ہے۔ ابن آدم نے بچوں کے لیے سات طلسماتی ناول لکھے ہیں۔ (1) جادو (2) جادوگر (3) جادوگر بادشاہ (4) جادوگر شہزادی (5) ایولین کی شہزادی (6) یوشیا کا جادوگر (7) روبون ناول ''جادو'' داستانی اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ ناول نگار کی یہ خوبی ہے کہ اس نے داستانوی فن سے

متاثر ہوکر پرانی روایت کا لحاظ بھی رکھا۔ ناول کا موضوع داستانوی کہانیاں ہیں۔ قاری پڑھتے وقت لطف محسوس کرتا ہے اور خیالی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ ناول کا مرکزی خیال اچھائی اور برائی کی لڑائی اور اچھائی کی جیت ہے۔

ابنِ آدم کا ناول ''جادوگر'' بھی نہایت دلچسپ اور پُرتجسس ہے۔اس کی کہانی '' ہماتم '' جادوگر کے گرد گھومتی ہے جس پر ایک دوسرے جادوگر نے جادو کر کے اسے پتھر بنا دیا ہے۔ ہماتم خود سے اس جادو کو توڑ کر آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس جادو کو توڑنے میں ایک وفادار ساتھی اس کی مدد کرتا ہے۔ نصیر ناول کا مرکزی کردار ہے جو اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر مظلوموں کی مدد کرتا ہے۔ نصیر جو ایک عام انسان ہے۔ لیکن اللہ پر ایمان اور بھروسے کے دم پر وہ جادوگروں سے بھی زیادہ طاقت ور اور ہوشیار ہے۔ ناول کی خوبی یہ ہے کہ ناول نگار نے اس میں اللہ کی وحدانیت کو پیش کیا ہے۔ بقول ناول نگار:

> ''بے شک خدا کی قدرت ہر ظلم کا جواب رکھتی ہے۔ ہر ظلم اپنے خالق کے ساتھ ہی دنیا سے فنا ہو جاتا ہے۔ ایک خدا پر ایمان رکھتے ہوئے اسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔''3

''وہ جادو گر ہماتم کو اس جادو سے نجات دلانے میں اپنی جان کی بازی لگادیتا ہے .وہ اس مہم کو پورا کرکے جادوگر کو پتھر سے پھر انسان بنا دیتا ہے . بچوں کی ذہانت اور ان کی دنیا بڑوں کی دنیاسے بہت مختلف ہوتی ہے مصنف نے بالکل بچوں کی ذہنیت کے مطابق سادہ اور پر کشش انداز میں یہ ناول تحریر کیا ہے. ناول نگار نے دلچسپی کے ساتھ ساتھ اخلاقی درس دینے کی بھی کوشش کی ہے.''

وہ جادوگر ہماتم کو اس جادو سے نجات دلانے میں اپنی جان کی بازی لگادیتا ہے۔ وہ اس مہم کو پورا کرکے جادوگر کو پتھر سے پھر انسان بنا دیتا ہے۔ بچوں کی ذہانت اور ان کی دنیا بڑوں کی دنیا سے بہت مختلف ہوتی ہے مصنف نے بالکل بچوں کی ذہنیت کے مطابق سادہ اور پر کشش انداز میں یہ ناول تحریر کیا ہے۔ ناول نگار نے دلچسپی کے ساتھ ساتھ اخلاقی درس دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ نصیر اور الگان کی شخصیت سے دوسروں کی مدد کرنے اور اپنی آخرت سنوارنے کا درس ملتا ہے۔ ناول کا اختتام بہت اچھا ہے ہماتم جادوگر کے اس ''جادو حیات'' سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس کی حویلی اور اطراف کے پورے علاقے میں بہار آجاتی ہے۔

مہارشٹرا میں بچوں کے ادب کی تخلیق واشاعت بھی بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے۔ مطالعے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مہارشٹرا میں بچوں کے ناول بھی کثیر تعداد میں لکھے گئے ہیں۔ بچوں کے لیے ناول لکھنے والے تقریباً تمام ناول نگاروں نے بچوں کی دلچسپی اور ان کی نفسیات کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ ان ناولوں کے ذریعے جہاں ان میں مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہیں ان کے اخلاق و کردار کو بلند کرنے، ان میں ہمت اور حوصلہ پیدا کرنے اور ان میں سائنسی شعور بیدار کرنے کی بھی قابلِ قدر کوشش کی گئی ہے۔ مہارشٹرا کے یہ ناول نگار اپنے گراں قدر ناولوں کے ذریعے اردو ناول کے فروغ اور ارتقا میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مہارشٹرا میں 1980 کے بعد ادبِ اطفال کے مطالعے کے حوالے سے بلا تامل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مہارشٹرا میں اردو ناول کا مستقبل روشن ہے۔

حواشی

1 خوفناک حویلی، وکیل نجیب: رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں 1995، ص29

2 واپسی، وکیل نجیب: رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں 1999، ص7

3 مریخ کا حملہ، ایم یوسف انصاری: رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں 2012، ص80

□□□

Dr. Habibunnisa Begum
Asst. Professor & Head
Dept. of Urdu
D.S.M College
Parbhani-431401(M.S)
habibainamdar.123@gmail.com

قمرالنساء۔ کے

منٹو کے افسانے میں نسوانی کردار

منٹو حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے اردو افسانے کو نیا رنگ وآہنگ عطا کیا۔وہ فرضی دنیا کے نہیں بلکہ حقیقی دنیا کے باشندے ہیں۔اپنے افسانوں میں عورت کو مختلف روپ سے پیش کرتے ہیں اور اسی پر ظلم ڈھانے والوں کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔اس طبقے کی زندگی، اس کے حالات، اس کی مجبوریاں، اس کی نفسیاتی الجھنوں کو تفصیل سے بیان کرنے میں وہ گریز نہیں کرتے۔سعادت حسن منٹو نے اپنی افسانہ نگاری کی ابتدا سیاسی افسانوں سے کی۔ان کے سیاسی موضوعات پر قلم بند افسانوں میں نیا قانون، سورج کے لیے اور یزید قابل ذکر ہیں۔

منٹو کے افسانے دیگر افسانہ نگاروں کے افسانوں سے بالکل جداگانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔انھوں نے اپنے اکثر افسانوں میں طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔طوائف کا موضوع اردو ادب میں کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔تاہم منٹو نے اپنے خاص انداز وفکر اور ندرت خیال اور ژرف نگاہی سے اس کو ایک نئی جہت دی ہے۔ان کے افسانوں میں زندگی کے گوناگوں تجربات اور اس دور کے مسائل درآئے ہیں۔انداز بیان' زبان کی معنی خیزی' تہداری الفاظ کا برمحل استعمال اور مکالمے کی دل آویزی ان کے افسانوں کا امتیاز ہے۔ان کے یہاں نسوانی کرداروں کے متنوع پہلوؤں جیسے بے رخی تنہائی پسندی صبر وتحمل وغیرہ کو اجاگر کیا گیا ہے۔

منٹو کے افسانوں کی ایک خوبی حقیقت نگاری ہے۔ان کی حقیقت نگاری افسانوں کی روح میں رچی بسی ہے۔وہ اس بات پر بضد ہیں کہ ان کے افسانوں میں کوئی غیر واقعیت پسندانہ بات داخل نہ ہو۔منٹو کے دل ودماغ پر جنسیات کا بھوت سوار ہے۔وہ فرائیڈ کے نظریات سے بے حد متاثر ہیں۔ان کے افسانوں میں جنس کی کارفرمائی بیشتر موقعوں پر نظر آتی ہے۔جنس نگار ادیبوں میں ان کا نام سب سے اہم ہے۔

ان کے افسانوں میں جنسیات کے علاوہ کرداروں کی شخصیت کے گوناگوں پہلو بھی ابھرے ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں کے کرداروں کو نہایت ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔افسانوں میں مرد' عورت' بچے' بوڑھے تمام کرداروں کو ایک ہی حیثیت حاصل ہے۔انھوں نے نسوانی کرداروں کو نہایت ہی ہمدردانہ نظر سے دیکھا ہے۔ان کی طرف وہ غیر جانبدار نظر آتے ہیں۔منٹو اپنے افسانوں میں مختلف نسوانی کرداروں کی پیشکش میں کئی روپ سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں دعا، آگ وغیرہ افسانے دیکھے جا سکتے ہیں۔ان افسانوں میں افسانہ نگار کے احساسات کی گرمی بھی ہے' طنز بھی ہے' ظرافت بھی ہے' افسردگی بھی ہے اور غمناکی کے گہرے سائے بھی۔منٹو کے تمام کردار صرف اس کے تخیل کی پیداوار نہیں جو گہرے مطالعے اور مشاہدے کا ثبوت دیں۔ان کے کردار طرح طرح کے ہوتے ہیں اور وہ ان سب کی نفسیات کا مطالعہ بڑے شوق وذوق سے کرتے ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں اشاروں اور کنایوں سے کام لیتے ہیں۔

منٹو کے یہاں عورت کے مختلف رنگ روپ ہیں۔متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی بیباک عورت، مجرمانہ مزاج والی عورت، اور مردانہ صفت سے متصف عورت وغیرہ۔ان عورتوں کے خد وخال کو نہایت ہی موثر انداز سے اجاگر کیا گیا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک ماں

کے طور پر زندگی بسر کرنا نسوانی تکمیل کا نقطۂ عروج ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں جن نسوانی کرداروں کو ابھارا ہے وہ محبت، ایمانداری، خلوص وسلیقہ مندی کے جذبات سے مملو ہیں۔منٹو کی نظر میں عورتیں نرم و نازک معصوم اور پاکیزہ ہیں اور ان کے رنگ روپ میں ممتا اور محبت کے خالص جذبے رواں دواں ہیں۔وہ دوسروں کے حق میں ایک سایہ دار درخت بن کر رہتی ہیں۔ان کی روح میں خدمت کرنے کا جذبہ ہے۔چاہے وہ شوہر ہو بھائی بھی ہو یا والدین۔عورتوں سے منٹو کی محبت کی گہرائی کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے افسانوں کا گہرا مطالعہ لازمی ہے۔اس لیے ہم بلاشک کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں یہ ذات مجسم حسن و جمال ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جب کبھی عورت کے دل میں ماں کی ممتا جاگ اٹھتی ہے تو وہ اس خالص مادری جذبے کے سامنے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتی ہے۔منٹو نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔سعادت حسین منٹو نے یہ بات کہی تھی کہ ’اگر آپ میری کہانیوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آج زمانہ ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔میرے اندر جو بھی برائیاں ہیں ان کا تعلق اس عہد سے بہت گہرا ہے اور جس نقص کو آپ میری ذات سے منسوب کرتے ہیں فی الواقع وہ نقص موجودہ نظام کا نقص ہے۔ منٹو کی یہ باتیں سماج اور معاشرے کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔

عورت اور اس کی حرمان نصیبی کے مسائل منٹو کے افسانوں کا خاص موضوع ہیں۔انھوں نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ عورتیں ہر حال میں مرد کی پشت پناہی پر مجبور کی جاتی ہیں۔اس لیے مرد ہمیشہ اس مجبوری کا فائدہ اٹھانے کی ہر ممکن کوششیں کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورتیں ماں، بہن، وغیرہ کا رول ادا کرتی ہیں۔ منٹو ایک اخلاقی فنکار ہیں۔ان کے زیادہ تر افسانے فن کارانہ تکمیل و تجربات اور موضوع کی رنگارنگی کے عمدہ نمونہ ہیں۔ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ گرے پڑے انسان میں بھی انسانیت کی کھوتلاش کر لیتے ہیں۔منٹو کے فن کی ایک اہم خوبی انسانی کردار کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ان کے کئی افسانے مثلاً بھانجے، ڈرپوک، ٹیڑھی لکیر وغیرہ نفسیات پر مبنی ہیں۔

منٹو نے اپنے افسانوں کے ذریعے زندگی کی المناکی اور ہولناکی کا مشاہدہ کیا ہے۔ان کے زیادہ تر افسانوں کا موضوع شہری زندگی کی پیچیدگیاں ہیں۔طوائف عیاش عورتوں کا نفسیاتی مطالعہ منٹو کو خاص طور پر پسند ہے۔کیونکہ پونا، دلی اور بمبئی میں گزاری ہوئی جس طرح کی زندگی نے انھیں وہاں کرداروں کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا۔طوائف پر مبنی منٹو کے افسانوں میں کالی شلوار، پہچان، ہتک، دس روپے جانگی، بری لڑکی شانتی، سراج اور سرکنڈوں کے پیچھے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔منٹو طوائف میں عورت کے مختلف روپ دیکھتے ہیں۔اس کی مثالیں جانگی، بری لڑکی، فوبھا بھائی اور مسمی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔طوائف کی تصویر کشی میں حقیقت نگاری عروج پر ہے۔ان کی افسانہ نگاری کی ابتدائی کاوشوں میں کالی شلوار، پہچان، ہتک، خوشیا اور دس روپے وغیرہ میں حقیقت نگاری کی جھلک نمایاں ہے۔وہ طوائف کو اپنی زندگی کی تنہائیوں، محرومیوں اور چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

منٹو طوائف کی زندگی پر مبنی افسانوں کے ذریعے ہمارے دلوں میں ہمدردی کے جذبات ابھارنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان طوائف کے اندر چھپی ہوئی عورت کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔انھوں نے طوائف کے روپ میں صرف طوائف کا نقشہ نہیں کھینچا، جامع صفات والی عورتوں کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔انھوں نے طوائف کی پیشہ ورانہ زندگی کی پیشکش کے ساتھ ان کے اندر پوشیدہ عورت کی سادگی اور معصومیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے افسانوں میں عورت کی خدمت گزاری کے جذبات بھی نمایاں ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ایسی عورتوں کو پیش کیا ہے، جن کی فطرت میں یہ اوصاف شامل ہوں۔

منٹو کے افسانوں میں کردار نگاری کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔وہ اپنے کرداروں کا مطالعہ بہت قریب سے کرتے ہیں۔ان کے کرداروں کے لب و لہجہ اور حرکات و سکنات میں ان کی شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ان کے ہر کردار نہایت جاندار ہوتے ہیں کہ کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان سے پیدا شدہ مسائل پر وہ گہری نظر رکھتے ہیں۔کرداروں کے اخلاص اور اخلاقی جرأت کی جھلکیاں ہمیں ان کے افسانے ’’موزیل‘‘ میں ملتی ہیں۔اسی طرح کے

کرداروں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل خلوص اور ایثار کے جذبات سے پر ہے۔ کرداروں کے خلوص میں مصنف کے خلوصِ قلب کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ ان کا افسانہ بابو گوبنات کردار نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ان میں ماں کی محبت اور داشتے کی جنسیت کا خوشگوار مزاج ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں خوش طبعی اور دل بہلاوے کے سامان ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتے ہیں کہ حرام زادہ کو جنم دینا کوئی مہاپاپ نہیں بلکہ جنم دینے کے بعد ان کو گلی کوچوں میں آوارہ اور بے سہارا چھوڑ دینا مہاپاپ ہے۔

افسانہ ''زمانی بیگم'' میں عورت کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس عورت کو کئی طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ عورت پر کئی ذمہ داریاں بھی عائد ہیں۔ اس افسانے میں منٹو نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بچے کو جنم دینے کی ذمہ داری عورت پر ہے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے انھیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے بھی زمانی بیگم کی مصیبتوں کو بحُسن وخوبی بیان کیا ہے۔ اس میں منٹو نے عورتوں کی خدمت گزاری اور ایثار نفسی کو اجاگر کیا ہے۔ ''شہید ساز'' میں منٹو نے جوان اور بوڑھی عورتوں کی تصویر کشی کے ذریعے اس حقیقت کو ظاہر کیا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں جو بھی مال و دولت میسر ہو، اگر وہ عورت سے محروم رہے تو سب مال ومتاع رائگاں ثابت ہوگا۔ زندگی میں مرد اور عورت کی ضرورت کو ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے زندگی کے المیے کی شدت کا احساس دلایا ہے۔

منٹو کے افسانوں میں ایسی عورتوں کا بھی تصور ہے جو بازاروں میں بھیک مانگتی پھرتی ہیں۔ اس کوچہ گری سے وابستہ کئی مسائل منٹو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ افسانہ'' ڈارلنگ'' میں انھوں نے عورت کو بازار کی بکری کا مال بنا کر پیش کیا ہے۔ اس میں منٹو نے اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ عورت بیشتر مردوں کی نگاہ میں ناچیز اور حقیر ہے۔ یعنی وہ عورت سے پیار تو کرتے ہیں لیکن اپنی خواہش کی تسکین کے بعد وہ اسے بے سہارا اور بے آسرا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس افسانے میں منٹو نے چند بدمزاج عورتوں کی تصویر کشی کی ہے۔ جب تمام ملک میں بدانتظامی اور افراتفری کا عالم ہے تو یہ عورتیں رات کی اندھیرے میں تنہا اپنی موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر باہر نکل آتی ہیں۔ یہاں ان نوجوان لڑکیوں کی ہمت اور دلیری کا بیان مقصود ہے۔ البتہ اس افسانے میں انھوں نے بیباک اور باہمت خواتین کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس طرح اپنے افسانوں میں بازاروں اور سڑکوں پر دریوزہ گری کرنے والی عورتوں اور دھوکہ بازوں کے مکر و پھسلاوے میں پھنسنے والی عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ عورت کی عریانی کا منظر بھی منٹو کے افسانوں میں بہت ہے۔ افسانوں میں ان کا قلم عریاں نگاری اور فحش نگاری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کی مثال ان تحریروں میں ملتی ہے جب وہ کسی عورت کو افسانے کے تانے بانے میں پیش کرتے ہیں تو یہاں اس کے سینے کا ابھار اس کی سختی وغیرہ کے علاوہ دوسری تشریحات ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا قلم تہذیب وشائستگی کے دائرے سے باہر نہیں نکلتا۔ عورت کے جسم کے ہر حصے پر منٹو نقاب ڈالتے ہیں۔ کہیں وہ موقع کی مناسبت سے اس نقاب کو سرکا بھی دیتے ہیں۔

منٹو کی فحش نگاری ان کے لاشعور کا کرشمہ ہے۔ وہ انھیں محض اضطراری طور پر بلا سوچے سمجھے اپنے افسانوں میں استعمال کرتے ہیں۔ منٹو کے چند افسانوں میں عورت کے جنسی استحصال اور مظلومیت کی کہانیاں بھی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے المیے کا احساس اور مرد کے ہاتھوں زبوں حالی کا بھی ذکر ہے۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کے چند ناپسندیدہ روپ بھی ہیں۔ جیسے مجرمانہ روپ، مردانہ صفات والی عورت کا روپ وغیرہ۔ اس میں جنسی جذبہ بہت بیدار اور طاقتور نظر آیا ہے۔ منٹو نے اپنے افسانوں کے ذریعے اس بات کو بھی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ عورت کے سامنے مرد برہنہ ہوتا ہے، ورنہ دوسروں کے سامنے وہ اپنا ظاہری روپ لیے پھرتا ہے۔ بعض اوقات عورت مردوں کی فریب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں عورت کا تصور پیش کرتے ہوئے عورت اور مرد کی شخصیت کے ظاہری پہلو سچائی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں عورت کو ماں، بہن، بیوہ اور طوائف کا رول دیا ہے۔ طوائف پر تحریر کردہ افسانے بھی طوائف سے منٹو کی ہمدردی کا اظہار ہیں۔ وہ طوائفوں کے ذریعے بھی عورتوں کا مختلف رول دکھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طوائف ہوٹل اور کوٹھے پر طوائف

رول دکھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طوائف ہوٹل اور کوٹھے پر طوائف ہوتے ہوئے بھی گھر میں گھریلو بن جاتی ہے۔اس کی بے وقوفی بھرے دوسرے عیوب ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ طائف ان کے یہاں نسوانی کرداروں کا عکس ہے۔ان کے یہاں ہر عورت ایک دوسرے سے مختلف ہے اور اپنی انفرادی خصوصیت رکھتی ہے۔ان کے ہر افسانے میں انسان کی نفسیاتی بصیرت دوسرے سے مختلف نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے میں عورت ماں کے طور پر کھل کر سامنے آتی ہے اور عشق ممتا کے جذبہ میں ظاہر ہوتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جذبۂ عشق یقین کو جنم دیتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانے میں عورت کو بیوی سے زیادہ ماں یا بھابھی یا بہن کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ساتھ ہی ان کی خدمت گزاری اور ایثار شعاری کو بھی ایک اہم جز و بنا کر پیش کیا ہے۔انھوں نے عورتوں کے مسائل اور ان کے نوع بہ نوع تجربوں کا محاسبہ بھی کیا ہے۔انھوں نے متوسط طبقے کی عورتوں کو اپنے افسانوں میں خاص جگہ دی ہے۔وہ اپنے افسانوں میں عورتوں کے ذریعے سماج کے فرسودہ رسم ورواج کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔

''کھول دو'' میں انھوں نے ایسے ہی تصور کو سکینہ نامی ایک بیٹی کی زبانی ادا کرایا۔انھوں نے اس افسانے کے ذریعے ایک باپ کی اپنی بیٹی سے محبت کی روداد بڑے دلکش انداز میں پیش کی ہے۔اس افسانے کا اہم کردار سراج الدین کی اکلوتی بیٹی سکینہ اور چند رضا کار نوجوان ہیں۔کہانی یہ ہے کہ کوئی سکینہ کو اغوا کر کے کہیں دور لے جاتا ہے۔اس کا باپ اس کی تلاش میں دربدر کی خاک چھانتا رہتا ہے۔ آخر کئی دنوں کے بعد جب سکینہ کو سراج الدین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اس کی افسوس ناک حالت دیکھ کر وہ سراسیمہ ہو جاتا ہے۔بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر سراج الدین اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کی بیٹی مر گئی ہوگی۔اسے علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور ڈاکٹر نے 'کھول دو' کا لفظ انجانے میں استعمال کیا تو اس کا بے حرکت ہاتھ اچانک حرکت میں آجاتا ہے۔اس کا باپ اپنی بیٹی کو زندہ پا کر خوش ہو جاتا ہے۔منٹو نے اس افسانے میں اس نیم مردہ لڑکی کے ذریعے ایک ایسے کو جنم دیا ہے اور اس کے اختتام میں لفظ کھول دو ایک علامت کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔اس کے ذہن میں لفظ کھول دو کا صرف ایک ہی معنی ہے۔اس افسانے میں انھوں نے مادری تقدس کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

منٹو کا انداز بیان سیدھا سادہ ہوتا ہے۔وہ اپنے افسانوں کی زینت بڑھانے کے لیے تشبیہات و استعارات اور الفاظ کی تراش خراش سے کام نہیں لیتے۔ان کے اسلوب میں گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ انسانی جذبات اور احساسات کے ہر پہلو کی عکاسی بھی ان کی زبان اور اسلوب میں ہے۔منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گزری ہے۔ہر منزل پر منٹو نے کہانی کے ذریعے کئی باتیں قاری کے ذہن تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ان کے افسانے محض برائیوں کے حامل نہیں بلکہ چند اچھائیوں کے حامل بھی ہیں۔ان موضوعات میں سے بعض موضوعات منٹو کو زیادہ پسند ہے۔ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی تخلیقات سے اپنے فنکارانہ خلوص کا حق ادا کیا ہے۔کردار کو قاری سے متعارف کرنے کا ذمہ لیا ہے، وہ اپنی تمہید سے قاری کو بیدار کرتے ہیں اور ان کے دل میں افسانہ پڑھنے کی خواہش پیدا کر دیتے ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں سماجی مسائل کے مختلف پہلو اجاگر ہیں اور عورتوں کی ناگفتہ بہ افسوس ناک حالت پر بھی تبصرہ ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی ہمدردی' ایمانداری' خلوص نفسی وغیرہ کا اظہار بھی کیا ہے۔نیز انھوں نے عورتوں کو اخلاقی اور روحانی سطح پر اونچا اٹھانے کی کوشش بھی کی ہے۔منٹو کے افسانوں کے مطالعہ سے ہم اس حقیقت کی پہچان آسانی سے کرتے ہیں کہ پہلے عورت کیا تھی اور اب کیا ہے۔اس بات کو انھوں نے وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور وہ ایک حد تک کامیاب نظر آتی ہے۔

□□□

Dr. Kamrunneesa. K

Assistant Prof.

Dept. of Urdu

Sree Sankaracharya University of Sanskrit

Regional Campus

Koyilandy-673620 (Kerala)

شیبا کوثر

بہار کے چند اہم رسائل: مختصر جائزہ

اردو زبان کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک متحرک زبان ہے اور وقت کے ساتھ اپنے آپ کو سنوارتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں یہ اپنی چاشنی برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ ہمارے ملک کی آب و ہوا اس کو خوب خوب راس آتی ہے۔ جہاں ہر 20 کلو میٹر پر ایک نئے لب و لہجے سے آشنا ہونا پڑتا ہے اردو کی خصوصیت ہے کہ وہ ہر لب و لہجے کو اپنے آپ میں سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ ملک کی تعمیر و ترقی میں اس زبان نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ خاص کر سماج کو ایک دھاگے میں پرونے میں۔ جب کبھی بحرانی حالات کا سامنا ہوا تو ہر طرف انقلاب زندہ باد کے نعرے نے سماج میں جوش بھرنے کا کام کیا ہے۔ معاملہ ملک کی آزادی کا ہو یا نفرت کے خلاف جدو جہد کا اس زبان نے ہمیشہ ہی ایک کلیدی رول ادا کیا ہے۔ اسی وجہ کر اہل دل اس زبان کی ترقی کے لیے ہمیشہ سے کوشاں رہے ہیں۔ عوام سے اس زبان کو جوڑے رہنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اسی کوشش کی ایک کڑی اردو رسائل کا منظر عام پر لانا بھی ہے۔ چونکہ اردو رسائل نے بھی اس زبان کی ترقی میں اہم کردار نبھایا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اردو سے حقیقی محبّت رکھنے والوں نے اردو زبان کے رسائل کو منظر عام پر لانے میں بے شمار جدو جہد کی ہے اور اس زبان کو اپنا خونِ جگر پلایا ہے۔ ادیب اور شاعر سماج کے نباض ہوا کرتے ہیں۔ سماج میں پیش آنے والے مسائل پر ان کی گہری نظر ہوا کرتی ہے۔ رسائل نے ملکی اور عصری ضرورتوں کی تکمیل کی اور ادیبوں اور شعرا کے کلام اور ان کے حالات سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لیے ہندوستان کے مختلف خطوں سے رسائل جاری کیے گئے۔ اردو میں تجلاتی ادبی صحافت کے اولین نمونے دہلی کالج " قران السعد ین فوائد الناظرین، تحفتہ الحدائق اور محب وطن کی شکل میں ملتے ہیں۔ قران السعد ین، ہفتہ وار رسالہ کی شکل میں 1845 میں دہلی سے جاری ہوا۔ جس کی سالانہ قیمت 2 روپیہ تھی۔ یہ دہلی کالج پریس میں چھپا کرتا تھا اور کالج کے استاد پنڈت دھرم نارائن اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس کا معیار کافی بلند تھا اس کے مضامین تاریخی، معلوماتی اور وقیع ہوتے تھے۔ اس طرح رسائل کے سفر کا آغاز ہوا۔ اس سفر میں گلدستوں کا اہم کردار رہا۔ گلدستوں نے اردو کی ادبی صحافت کو کافی فروغ دیا اور اردو صحافت کو مجلّاتی صحافت کے دور میں لے جانے کے سلسلے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

''گل رعنا'' اردو کا پہلا گلدستہ ہے جسے مولوی کریم الدین نے اپنے ذاتی مطبع رفاہ عام، دہلی سے 1845 میں جاری کیا۔اس کو دیکھ کر ہندوستان کے دوسرے شہروں سے بھی گلدستے جاری ہوئے۔اردو کا پہلا ادبی رسالہ 1865 ''انجمن پنجاب'' کے نام سے جاری ہوا جس کو ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' (جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا) شائع کیا تھا۔یہ ایک اہم علمی و ادبی ماہانہ تھا، جس کے ایڈیٹر مولانا محمد حسین آزاد مقرر ہوئے۔اس رسالے کی افادیت کا اندازہ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے بخوبی ہو جاتا ہے جس میں علم وادب، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور اردو ادب سبھی موضوع شامل ہوا کرتے تھے۔اس کے مضمون نگاروں میں بابو چندر ناتھ مشر، پنڈت من پھول، مولانا محمد حسین آزاد، دیوان چندن، برکت علی خان، علم دار حسین، وغیرہ تھے۔بقول امداد صابری یہ رسالہ 1880 تک جاری رہا۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی رسالے کا ابتدائی دور تھا۔دھیرے دھیرے یہ سفر آگے بڑھتا گیا اور ہندوستان کے کئی شہروں سے رسالے منظر عام پر آنے لگے۔آج بھی بہت سارے رسالے ہندوستان کے کئی شہروں سے جاری کیے جاتے ہیں۔بہار بھی اس دور میں ہمیشہ سے اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہا ہے۔صوبہ بہار سے بھی کئی اہم رسالے شائع ہوئے جنھیں اہل علم و دانش کے بیچ خوب سراہا گیا۔میں یہاں ان چند رسائل کا تذکرہ چاہتی ہوں جو اپنے وقت کے کافی مقبول رسالے ہوا کرتے تھے اور جس کی گونج ہر طرف سنائی دیتی تھی جس سے بہار کی ادبی فضا معطر ہوئی اور ادبی فضا کو قائم رکھنے میں جس نے اہم رول ادا کیا۔

نہر الفوائد: شہر آرہ سے 21 مارچ 1868 کو نہر الفوائد کے نام سے ایک رسالہ جاری ہوا۔یہ سہ ماہی رسالہ تھا جو 25 صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔اس کے جاری کرنے والے مولوی سید وارث علی خان بہادر میر مجلس انجمن علمیہ تھے۔اس کے ایڈیٹر خواجہ سید فخر الدین دہلوی تھے۔اس رسالے میں علمی، ادبی، تاریخ اور ثقافتی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے اور عورتوں کے تعلق سے بھی مضامین ہوتے تھے۔انجمن علمیہ کی روداد اور خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔یہ رسالہ سید وارث علی اور سید فرزند احمد، صغیر بلگرامی کی علمی ، ادبی اور صحافتی ذوق کا آئینہ دار تھا۔سید وارث علی صوبۂ بہار میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس تھے۔یہ وہ دور تھا جب سر سید کی تحریک زوروں پر تھی اور اس کی موافقت اور مخالفت کا سلسلہ جاری تھا۔سید وارث علی ان دانشوروں میں تھے، جنھوں نے سر سید کی تحریک کے افکار و نظریات اور مقاصد و منہاج کا سنجیدگی سے جائزہ لیا اور پھر اس تحریک کی تائید اور حمایت کی۔وہ علم دوست اور ادب نواز تھے۔بہار کی تعلیمی سرگرمیوں سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔یہی وجہ تھی جو انھیں نہر الفوائد کی طرف گامزن کیا اور پھر علم و ادب کے فروغ کے لیے انھوں نے اس رسالے کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ادبی تذکروں میں یہ باتیں سامنے آئی ہیں کہ شائع ''نہر الفوائد'' بہار سے شائع ہونے والا پہلا رسالہ تھا۔جس کا تذکرہ اختر شہنشاہی نے بھی کیا ہے۔''

" معارف :خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف ،پٹنہ کے ترجمان ماھنامہ معارف کو خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشیں اور امارت شریعہ بہار و اڑیسہ کے پہلے امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ بدرا لدین قادری نے 1912میں جاری کیا۔اس کا پہلا شمارہ رجب 1330 ھجری کو منظر عام پر آیا، اس کے مہتمم و مالک سید محمّد مظہرالحق چشتی مجیبی اور مدیر و نائب مہتمم محمّد یوسف رضوی پھلواروی تھے۔معارف ایک معیاری رسالہ تھا۔اس کے اغراض و مقاصد بلند تھے اور ہر شمارہ کے پس ورق پر شائع ہوا کرتے تھے، جو مندرجہ ذیل تھے۔"

معارف: خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف ، پٹنہ کے ترجمان ماہنامہ معارف کو خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشیں اور امارت شریعہ بہار و اڑیسہ کے پہلے امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ بدر الدین قادری نے 1912 میں جاری کیا۔اس کا پہلا شمارہ رجب 1330 ہجری کو منظر عام پر آیا، اس کے مہتمم و مالک سید محمد مظہر الحق چشتی مجیبی اور

مدیر و نائب مہتمم محمد یوسف رضوی پھلواروی تھے ۔معارف ایک معیاری رسالہ تھا۔اس کے اغراض ومقاصد بلند تھے اور ہر شمارہ کے پس ورق پر شائع ہوا کرتے تھے، جومندرجہ ذیل تھے۔

(1)مسلمانوں کے ساتھ عموماً اور اہل طریقت میں خصوصاً ار تباط اتحاد بڑھائے رہنے کی کوشش وصورتیں پیدا کرتے رہنا۔

(2)اپنے اخوان اہل طریقت کی اخلاقی ،تمدنی ،معاشرتی سلوکی ومذہبی حالتوں کی درستگی واصلاح کے اسباب بہم پہنچانا۔

(3)مذہب اسلام وفرقہ صوفیائے کرام کی طرف سے بد گمانیاں دور کرتے رہنا۔

(4)مشائخ کوموجودہ زمانے کی روش سے آگاہ کرکے ان کو عالم مخلوق کی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا اور ان مقدس دلوں سے ان نئی روشنی والوں کی طرف نفرت یا بدمذہبی کا خیال اٹھانا جن کے دل پر ایمان واسلام قبضہ کیے ہوئے ہے۔

(5)علم تصوف کی علی العموم حمایت وخصوصیت کے ساتھ اس روش وطریقہ معاشرت وتدوین کی مدد جو اکابر صوفیا میں شائع تھی اور ہے یعنی علم کے ساتھ عامل ہونے کی ضرورت جتانا۔

(6)تمام دنیا کی خانقاہوں کے ان پسندیدہ رسومات کو جن میں اتباع سنت کا پہلو زیادہ پایا جائے ،شائع کرکے دیگر اہل خانقاہ کو اختیار کرنے کی ترغیب دینا۔

(7)دنیا کے تمام اولیائے کرام و مشائخ عظام کے مفید حالات زندگی سے وقتاً فوقتاً اکابر پھلواری کے واقعات زندہ سے اکثر قوم کو مطلع کرتے رہنا۔

(8)ان سطروں سے معارف کے اعلی مقاصد کو سمجھا جا سکتا ہے ۔اس میں دینی ،علمی مذہبی ،اخلاقی و تاریخی مضامین شائع ہوا کرتے تھے ۔چار سالوں تک یہ رسالہ پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔اس کے بعد اس کی اشاعت کا سلسلہ بند ہوگیا۔

بہارستان: ماہنامہ بہارستان کی شروعات اپریل 1938 کو پٹنہ سے ہوئی ۔یہ رسالہ 48 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا ۔جس کے ایڈیٹر عبدالجبار وحیدی اور اصغر مجیبی تھے ۔اس رسالے میں عام طور سے علمی ادبی ،تنقیدی ،تمدنی اور سائنسی مضامین شائع ہوا کرتے تھے ۔ساتھ ساتھ شعرا اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں ۔یہ ایک اہم اور اپنے وقت کا معیاری رسالہ تھا ۔اس کی طباعت معیاری ہوتی تھی مواد کے علاوہ ترتیب اور ظاہری اعتبار سے بھی رسالہ پرکشش ہوتا تھا ۔بہارستان میں اس وقت کے نامور قلم کاروں کی تخلیق شائع ہوتی تھی ۔ان میں مولانا ریاست علی ندوی ،ڈاکٹر عظیم الدین ،اختر اورینوی ،نجم الحسن صاحب ندوی اور شکیلہ خاتون کے نام قابل ذکر ہیں ۔اس رسالہ کا خاص مقصد بہار کے تعلیم یافتہ طبقہ میں پاکیزہ ادب کا صحیح شوق وذوق پیدا کرنا تھا۔

ندیم: یہ رسالہ اپنے وقت کا ایک اہم رسالہ تھا جو شہر گیا سے شائع ہوا کرتا تھا۔اس کی شروعات جون 1931 میں ہوئی یہ بہار سے شائع ہونے والا مقبول اور کثیر الاشاعت رسالہ تھا، جو ایک ماہنامہ تھا۔اس کے سرورق پر آئین ندیم درج رہتا تھا جس میں اس کے مقاصد درج رہتے تھے ۔اس کے ادارئے " نظریات " کے عنوان سے ہوا کرتے تھے ،جس میں مقاصد اور عزائم بیان کیے جاتے تھے ۔اس کے اداریے کافی پسند کیے جاتے تھے۔

ندیم کے ایڈیٹر انجم مانپوری تھے ۔معاون مدیر کی حیثیت سے عبدالقدوس ہاشمی اپنے فرائض انجام دیا کرتے تھے ۔ندیم کے پہلے شمارہ میں جوش ملیح آبادی کی نظم آمد شباب شائع ہوئی تھی، جو کافی مقبول ہوئی ۔اس کا بہار نمبر اگست 1933 میں منظر عام پر آیا جس کی ادبی دنیا میں خوب خوب پذیرائی ہوئی ۔اس کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے ۔اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے وقت کا ایک اہم رسالہ تھا جس نے بہار میں ادبی روایت کو آگے بڑھایا۔انجم مانپوری کے بعد سید محی الدین ندوی اس کے مدیر ہوئے اور 1949 تک رسالہ ان ہی کی ادارت میں نکلتا رہا اس کے بعد اس کی اشاعت کا سلسلہ بند ہوگیا۔

□□□

Sheeba Kausar
Mohalla: Brah Batrah
Arrah-802301 (Bihar)
Sheebakausar35@gmail.com

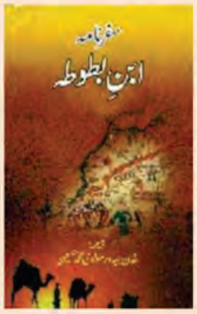

عامر عباس

مابعد جدید خواتین کے سفرنامے

انیسویں صدی میں اردو سفرنامہ نگاری کا باضابطہ آغاز ''یوسف خاں کمبل پوش'' کے ہاتھوں ہوتا ہے جنھوں نے سفرنامہ ''عجائباتِ فرہنگ'' لکھ کر اس صنف کی باقاعدہ داغ بیل ڈالی۔ اس کے بعد معتد ادیبوں نے سفرنامے لکھے۔ بیسویں صدی کے آتے آتے اردو سفرنامہ نگاری میں بے شمار مرد حضرات کے علاوہ خواتین قلم کاروں نے بھی سفرنامے لکھے۔ اردو کی پہلی باقاعدہ خاتون سفرنامہ نگار'' نازلی رفعیہ سلطانہ'' ہیں۔ ان کا سفرنامہ'' سیر یورپ'' ہے جو خطوط کی تکنیک میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ سفرنامے کی روایت کو آگے بڑھانے میں عطیہ فیضی، شاہ بانو، بیگم سربلند جنگ بہادر، صغریٰ بیگم، سلطان آصف فیضی، امیر خانم، بیگم تاج یاسین، مہر النساء، امت القدیر، اختر ریاض الدین، نسرین بانو اکرم، قرۃ العین حیدر اور بیگم نشاۃ النساء وغیرہ نے اہم رول ادا کیا۔

مابعد جدید دور میں اردو شعر و ادب میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ موضوع کے ساتھ ساتھ فن کا بھی خاص خیال رکھا جانے لگا۔ اس دور میں ادیب کسی مخصوص زاویہ فکر تک محدود نہیں تھے بلکہ انھیں ہر طرح کے موضوعات کو بیان کرنے کی پوری آزادی میسر تھی۔ موضوع و فن کی اس خوشگوار تبدیلی اور جدید رجحانات و خیالات کے اثرات کو 1980 کے بعد لکھے گئے سفرناموں میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مابعد جدید دور میں مرد سفرنامہ نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین سفرنامہ نگاران کے شانہ بہ شانہ سفرنامے کی روایت کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ 1980 کے بعد خواتین سفرنامہ نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں ش فرخ، بشریٰ رحمٰن، بلقیس ظفر، پروین عطف، نجمہ افتخار، کوثر جمال، تابندہ بتول، حمیدہ حسین، منیر فاطمہ، دردانہ قاسمی، زینت مسعود زینب، صغرا مہدی، قرۃ العین طاہرہ، نعیم فاطمہ علوی، ثریا حسین، صالحہ عابد حسین، کشور ناہد، بیگم سلمٰی اعوان، سائرہ ہاشمی، نوشابہ نرگس، کوکب خواجہ، ڈاکٹر فرخندہ جالی، بلقیس ریاض، ذکیہ ارشد، ثریا حفیظ رحمان اور خالدہ ادیب قابل ذکر ہیں۔ ان خواتین سفرنامہ نگاروں نے اپنے منفرد انداز بیان سے اس صنف کو مزید نکھار بخشا۔

''مسافتیں کیسی'' (1982) بلقیس ظفر کا یہ سفرنامہ مابعد جدید دور کا ایک اہم سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامہ میں مصنفہ نے اپنے

''اس سفرنامہ میں انھوں نے بیروت کے حالات زمانہ امن اور دوران جنگ کی تصویر کشی کچھ اس انداز میں کی ہے کہ تمام مناظر اپنی ہولناکیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ سفرنامے کے ابتدائی حصے میں جنگ سے پہلے کا بیروت، جس میں ہنستے مسکراتے لوگ رنگین پیرھن پہنے ہوئے نئی زندگی کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ پہلے حصے میں لبنان کے موسموں، وہاں کے تہواروں، خوراک، رھن سھن، لباس، کے علاوہ اقتصادیات اور وہاں کے معاشرتی نظام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں بلقیس نے لبنان کی جنگ کے ہولناک واقعات کو تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی حوالہ جات اور قرآن مقدس کی آیات کا ترجمہ انسان کی تباہی و بربادی کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔''

شوہر کے ساتھ کیے ہوئے سفر کی روداد کو قلم بند کیا ہے۔''مسافتیں کیسی''، لبنان کی خانہ جنگی کے بارے میں ہے جہاں بلقیس ظفر کے شوہر پاکستانی سفارت خانے میں سیکٹری کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ان کی اہلیہ ان کے ساتھ لبنان میں مقیم تھیں۔اس سفرنامہ میں انھوں نے بیروت کے حالات زمانہ امن اور دورانِ جنگ کی تصویر کشی کچھ اس انداز میں کی ہے کہ تمام مناظر اپنی ہولناکیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔سفرنامے کے ابتدائی حصے میں جنگ سے پہلے کا بیروت، جس میں ہنستے مسکراتے لوگ رنگین پیرہن پہنے ہوئے نئی زندگی کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔پہلے حصے میں لبنان کے موسموں، وہاں کے تہواروں، خوراک، رہن سہن، لباس، کے علاوہ اقتصادیات اور وہاں کے معاشرتی نظام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔دوسرے حصے میں بلقیس نے لبنان کی جنگ کے ہولناک واقعات کو تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی حوالہ جات اور قرآن مقدس کی آیات کا ترجمہ انسان کی تباہی و بربادی کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔

''سفر زندگی کے لیے سوز و ساز''(1982) سفرنامہ صالحہ عابد حسین کا بہت ہی مشہور سفرنامہ ہے۔یہ سفرنامہ ان کے متعدد مقامات کے سفر کی دلچسپ روداد ہے۔ یہ سفرنامہ ہندوستان کے اندرون علاقوں کے علاوہ پاکستان، انگلستان، پیرس، سوئزر لینڈ، اٹلی کے ساتھ ساتھ حج کے روحانی تاثرات کا بیان بھی ہے۔اس سفرنامے میں ہندوستان کے مختلف شہروں شملہ، کشمیر، نینی تال، رانی کھیت، الموڑا، مہابلیشور، بمبئی، بھوپال، آگرہ، حیدرآباد، احمد آباد، علی گڑھ، پٹنہ، بنارس، لکھنؤ، راجستھان، اجمیر، جے پور، مدراس، میسور، بنگلور اور پونہ وغیرہ کے خوبصورت وسحر انگیز مناظر کو صالحہ عابد حسین نے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔مصنفہ نے اس سفرنامے میں مختلف مقامات کی خوبصورتی، قدرتی مناظر و ماحول، پہاڑ، ندی، سمندر، جھرنا، دریا، سبزہ زاروں کے علاوہ عمارتوں، بازاروں، سڑکوں اور عبادت گاہوں کا ذکر مؤثر انداز میں کیا ہے۔اس سفرنامے میں مصنفہ نے زمین پر جنت کہلانے والے ٹکڑے کشمیر کی بہت تعریف کی ہے۔کشمیر کا نظارہ ان کے لیے سب سے زیادہ پر لطف تھا۔صالحہ عابد حسین نے کشمیر کے خوش کن مناظر و ماحول کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔اس سفرنامے کا آغاز ہی انھوں نے کشمیر کے خوبصورت مناظر سے کیا ہے۔

''پیرس و پارس''(1984) پروفیسر ثریا حسین کا ایک اہم سفرنامہ ہے۔اس میں انھوں نے فرانس، جرمنی، اٹلی، انگلستان اور ایران کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ پروفیسر ثریا سے گورنمنٹ اسکالرشپ پر 1957 میں سوربون یونیورسٹی سے گارساں دتاسی پر ریسرچ کی غرض سے پیرس کا رخ کیا۔وہاں ان کا تین سال قیام رہا۔ دوران قیام ثریا حسین نے نہ صرف اپنے تحقیقی کام کو انجام دیا بلکہ وہاں کی تہذیب و ثقافت کا بھی کھلی آنکھوں سے جائزہ لیا۔اس سفرنامے میں ان کی مشاہداتی قوت اور تجرباتی صلاحیت کے سارے نقوش موجود ہیں۔اس سفرنامے میں ثریا حسین نے پیرس کی تاریخی اہمیت، مختلف قدرتی و تفریحی مقامات، تجارتی علاقوں، محلوں، بازاروں، عدالتوں، کلیساؤں، گرجا گھروں، عوامی زندگی، تہذیب و ثقافت اور خصوصی طور پر وہاں کی تعلیم و ادبی صورت حال اور مختلف اساتذہ کا ذکر

کیا ہے۔اس سفر نامے میں مصنفہ کے 1970 میں ایران کے سفر کا بھی ذکر ملتا ہے جہاں انھوں نے دو سال قیام کیا۔اس سفر نامے میں ثریا حسین نے ایران کے تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ وہاں کی سیاسی،سماجی،معاشی،تعلیمی وتہذیبی صورت حال کی جاندار تصویر کشی کی ہے۔اس سفر نامے میں مصنفہ نے فرانس اور ایران میں گزارے وقت کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گزارے شب و روز کو بھی خوبصورت یادوں کے سہارے قلم بند کیا ہے۔غرض ثریا حسین کا یہ سفر نامہ نہایت معلوماتی اور مشاہداتی ہے۔دورانِ سفر انھوں نے جو کچھ بھی دیکھا ہے اور جو چیزیں انھیں معلوماتی معلوم ہوئی ان کا ذکر کر دیا۔یہ سفر نامہ درحقیقت دو تہذیبوں یعنی مشرق ومغرب کا اتصال ہے۔اس سفر نامے میں مصنفہ نے ادب کے قارئین کو دو مختلف اور متضاد تہذیب وتمدن سے روشناس کرانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔

''میرے بھی سفر نامے'' (1987) نجمہ افتخار راجہ کا پہلا سفر نامہ ہے۔انھوں نے اپنے شریک حیات کے ہمراہ مختلف ممالک کا سفر کیا ہے۔انھوں نے پیرس میں منعقد ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اپنے شریک حیات کے ہمراہ شرکت کی اور اس کے ساتھ ساتھ لندن،فرانس اور امریکہ کے مختلف مقامات کی سیر کی۔سفر نامہ میں مصنفہ ایک عام عورت کی طرح اپنے شہر سے ڈیگال تک ایک سلیقہ مند خاتون کی طرح کفایت شعاری کا درس پلو سے باندھے ہوئے امریکہ،کولمبو اور پیرس تک کا سفر کرتی ہیں۔اس سفر نامے کی مقبولیت کا راز اس کی سادہ زبان اور پر کشش انداز بیان ہے۔ان کا اسلوب سادہ اور رواں ہے۔اس میں کسی قسم کا کوئی تکلف وتصنع نہیں ہے۔''سایو نارا'' (1989) ان کا دوسرا سفر نامہ ہے۔یہ سفر نامہ بینکاک،تھائی لینڈ اور جاپان کا سفر نامہ ہے۔یہ سفر انھوں نے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کیا ہے۔اس سفر نامے میں بھی ان کے بیان کی سادگی اور مشاہدے کی گہرائی نظر آتی ہے۔جاپانی تہذیب،ان کی روایت،گھریلو زندگی اور ان کے اطوار کے ساتھ ساتھ وہاں کی سیاسی،سماجی،ثقافتی اور صنعتی صورت حال سے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔اس سفر نامے میں بھی انھوں نے بطور سیاح جاپان کو نہیں دیکھا بلکہ ایک تاریخ دان کی طرح جاپان کے شہروں کا احوال ان کے تاریخی پس منظر میں بیان کیا ہے۔

''سیر کر دنیا کی غافل'' (1994) صغرا مہدی کا مشہور سفر نامہ ہے۔صغرا مہدی ایک نمایاں ادبی شخصیت ہے جو ناول نگاری،افسانہ نویسی،تنقید و تحقیق کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کے لیے مشہور ہیں۔اپنی زندگی کے دوران انھوں نے اندرون ملک اور بیرون ملک کے متعدد سفری تجربات حاصل کیے جنھیں سفر ناموں کے ذریعے پیش کیا۔ان کے سفر نامے نہ صرف دلچسپ مشاہدات کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ ان کے منفرد انداز بیان کے باعث اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔''سیر کر دنیا کی غافل'' صغرا مہدی کے چھوٹے چھوٹے سفر ناموں کا مجموعہ ہے۔اس میں انھوں نے انگلینڈ کے سفر کو خاص طور پر بیان کیا ہے۔یہ سفر انھوں نے اپنی کزن کے ساتھ کیا۔لندن پہنچنے کے بعد انھوں نے وہاں کے مشہور مقامات جیسے برٹش میوزیم،

''اس سفر نامے کی مقبولیت کا راز اس کی سادہ زبان اور پر کشش انداز بیان ہے۔ان کا اسلوب سادہ اور رواں ہے۔اس میں کسی قسم کا کوئی تکلف وتصنع نہیں ہے۔''سایو نارا'' (1989) ان کا دوسرا سفر نامہ ہے۔یہ سفر نامہ بینکاک، تھائی لینڈ اور جاپان کا سفر نامہ ہے۔یہ سفر انھوں نے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کیا ہے۔اس سفر نامے میں بھی ان کے بیان کی سادگی اور مشاہدے کی گہرائی نظر آتی ہے۔جاپانی تہذیب، ان کی روایت، گھریلو زندگی اور ان کے اطوار کے ساتھ ساتھ وہاں کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور صنعتی صورت حال سے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔اس سفر نامے میں بھی انھوں نے بطور سیاح جاپان کو نہیں دیکھا بلکہ ایک تاریخ دان کی طرح جاپان کے شہروں کا احوال ان کے تاریخی پس منظر میں بیان کیا ہے۔''

نیشنل آرٹ گیلری، عجائب گھر، کیمبرج اور شیکسپیئر کے وطن کی سیر کی۔ انھوں نے لندن کے عجیب وغریب موسم، لوگوں کے رویے اور انگریزوں کے معاشرت اور نظم وضبط کو گہرے مشاہدے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لندن میں تین ہفتے گزارنے کے بعد مصنفہ جنیوا، اور پیرس ہوکر دہلی واپس آئیں۔ صغرا مہدی کا یہ سفرنامہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں مثلاً ان کی ہمدردی، حساس طبیعت، کشادہ ذہن، فراخ دلی، شگفتہ مزاجی، صاف گوئی، نیک دلی اور سچائی کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کا ایک اور سفرنامہ ''مشاہدات ابن بطوطہ'' ہے جو پیرس، لندن اور امریکہ کے سفری تجربات پر مبنی ہے۔ ایک اور سفرنامہ ''میخانوں کا پتہ'' ہے۔ یہ کتاب ایک مکمل سفرنامہ نہیں ہے بلکہ مختلف سفری روداد کا مجموعہ ہے۔ اس میں درج ذیل سفرنامے شامل ہیں۔ ''میخانوں کا پتہ''۔ ''سات دن کیکو کے دیس میں''۔ ''سمندر سمندر''۔ ''ایک بار پھر امریکہ''۔ ''ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو''۔ صغرا مہدی کے سفرنامے اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان میں مشاہدے کی باریکی اور اظہار کی برجستگی ہے۔ ان کے سفرنامے نہ صرف قاری کو مختلف ممالک، شہروں اور ثقافت سے متعارف کرواتے ہیں بلکہ ان کا دلچسپ انداز بیان اور مزاحیہ طرز تحریر سفر کے تجربوں کو مزید دلکش بنادیتا ہے۔

صادقہ ذکی دہلی کی ایک معروف ادبی شخصیت ہیں۔ انھوں نے 1997 میں حج اور روضۂ رسول ﷺ کی زیارت کے لیے سفرِ حجاز کیا۔ اس روحانی سفر کے دوران اپنے تجربات اور مشاہدات کو انھوں نے ایک سفرنامے میں قلمبند کیا، جو بعد میں "خیموں کے شہر میں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ سفر 29 مارچ 1997 کو ایک گروپ کے ساتھ جدہ پہنچنے سے شروع ہوا۔ اسی شام وہ مکہ مکرمہ پہنچ گئیں۔ 13 اپریل کو مدینہ منورہ روانہ ہوئیں اور وہاں نو روز قیام کیا۔ 12 اپریل کو دوبارہ مکہ مکرمہ آئیں اور 18 اپریل تک مناسکِ حج ادا کیے۔ 29 اپریل کو وہ جدہ واپس گئیں اور 30 اپریل کو دہلی پہنچ کر یہ سفر مکمل کیا۔ یہ سفرنامہ 3 اگست 1997 سے 12 جنوری 1998 تک جریدہ "قومی آواز" میں بطور ضمیمہ شائع ہوتا رہا، جبکہ اس کی کچھ قسطیں ماہنامہ "انشاء" کلکتہ میں بھی شائع ہوئیں۔ 1998 میں یہ ''سفرنامہ خیموں کے شہر میں'' کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ اس سفرنامے کو کسی خاص عنوان کے تحت پیش کرنے کے بجائے مصنفہ نے مسلسل بیانیہ انداز اپنایا ہے۔ اس سے قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود ان کے ساتھ سفر میں شریک ہے۔ ان کا انداز بیان نہایت جذباتی اور عقیدت سے بھرپور ہے۔ انھوں نے حج کے دوران پیش آنے والے لمحات کو نہایت گہرائی سے بیان کیا ہے۔ خاص طور پر عرفات، مزدلفہ، منیٰ کے تجربات کو انھوں نے روحانی اعتبار سے بہت اہمیت دی ہے۔ مدینہ منورہ میں روضہ رسول کی زیارت کا ذکر ان کے سفرنامے کا ایک انتہائی جذباتی اور اثر انگیز حصہ ہے جس میں انھوں نے اپنے دل کی کیفیت کو کھلے دل سے بیان کیا ہے۔

''عراق کا سفرنامہ'' (2002) زینت مسعود زینب کا سفرنامہ ہے۔ زینت مسعود زینب کا یہ سفرنامہ ان کے جذبات اور عراق سے گہرے تعلق کا مظہر ہے۔ یہ سفرنامہ عراق کے تاریخی، سماجی، اور روحانی پہلوؤں کو نہایت دلکش انداز میں پیش کرتا ہے۔ مصنفہ نے عراق کو اپنے خوابوں کی سرزمین قرار دیا ہے، جہاں جانے کو وہ اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہیں۔ اس سفر میں بسر کیے گئے لمحات اور تجربات کو انھوں نے ایمانداری سے قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سفرنامہ عراق اور ایران کے 1980 کی جنگ کے اثرات، تاریخی پس منظر، اور عراق کے جغرافیائی وثقافتی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ مصنفہ نے عراق کی سیاسی، سماجی، اور مذہبی صورت حال کو بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی وہاں کے موسم، مقامی مناظر، اور شہروں کی خوبصورتی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ روزمرہ کی زندگی اور رسوم ورواج کو پیش کرنے کے علاوہ وہ عراق کے روحانی مقامات کی تصویر کشی بھی کرتی ہیں۔ اس سفرنامے میں خاص طور پر حضرت عبدالقادر جیلانی، امام ابوحنیفہ، اور دیگر روحانی بزرگوں کے مزاروں کا ذکر شامل ہے۔ مصنفہ نے نجف شریف اور کربلا جیسے مقدس مقامات کی زیارت کے تجربات کو گہرائی سے بیان کیا ہے، جن سے قاری ان مقدس جگہوں کی عظمت اور روحانیت کو محسوس کرسکتا ہے۔ زینت مسعود زینب کی تحریر قاری کو عراق کی تاریخی عمارتوں، جنگی حالات، اور روحانی سفر کے ذریعے اس ملک کے دلکش پہلوؤں سے متعارف کراتی ہے، جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی

ہے۔ اس سفرنامے میں مصنفہ نے صدام حسین کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے۔ عراق سے انسیت ومحبت، وابستگی، ملک وقوم کے لیے ان کا احساس ذمہ داری اور خدمات جیسے موضوعات کو سفرنامے کا حصہ بنایا گیا ہے۔

''سفرنامہ حجاز وایران'' (2009) بیگم زہرہ بتول کا مقبول سفرنامہ ہے۔ بیگم زہرہ بتول، معروف عالم دین اور دارالسلام، عمرآباد (تامل ناڈو) کی نامور شخصیت جناب ابوالبیان حماد کی اہلیہ تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ حجاز اور ایران کا سفر کیا تھا، لیکن اس سفرنامے کی اشاعت سے قبل ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ یہ سفر انھوں نے جولائی 2008 میں کیا تھا اور اس سفر کی روداد کو کتابی شکل میں ''سفرنامہ حجاز وایران" کے عنوان سے 2009 میں اسلامک بک سینٹر، بنگلور نے شائع کیا۔ سفرنامے میں ان کی نظمیں، جیسے مجاہد کا کردار، اسلام کا مجاہد، سوئے حرم، اور مناظر مدینہ بھی شامل ہیں۔ اس سفر کے دوران وہ تہران کے علاوہ ایران کے کئی دیگر شہروں، جیسے کرمان، شہرایران، سردان، فاش، اربلان، اور شیراز بھی گئیں۔ شیراز میں انھوں نے شیخ سعدی اور حافظ کے مزارات کی زیارت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے قصر شاہی اور ایرانی مدارس کا دورہ بھی کیا۔ بیگم زہرہ بتول کا سفرنامہ زہرہ بتول کا سفرنامہ حجاز وایران نہ صرف ایک سفری روداد ہے بلکہ تہذیب وثقافت، ادب اور تاریخ کا ایک آئینہ دار بھی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات، مقامات کی تفصیلات، اور ذاتی تجربات کو نہایت شگفتہ اور فصیح زبان میں بیان کیا ہے۔ سفر کے ابتدائی حصے میں حجاز مقدس کے سفر کو خاص عقیدت اور احترام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کی زیارت کے دوران ان کے جذبات، روحانی کیفیت، اور وہاں کی فضا کا بیان قاری کو بھی ایک قلبی سکون اور خوشبو کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ زہرہ بتول کا طرزِ تحریر نہایت رواں اور دلکش ہے۔ انھوں نے اپنے سفر کی روداد کو جذباتی، روحانی، اور فکری انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری سفرنامے کو مزید خوبصورتی عطا کرتی ہے اور قاری کو ان کے خیالات کی گہرائی میں لے جاتی ہے۔

''خوابوں کا جزیرہ موریشس'' (2014) یہ سفرنامہ شعبہ اردو علی گڑھ کی پروفیسر دردانہ قاسمی کے سفرِ موریشس کی روداد ہے۔ دردانہ قاسمی نے اپنے شریک حیات ابوالکلام قاسمی کے ہمراہ مارچ 2011 میں موریشس کا سفر کیا تھا۔ موریشس کا یہ سفر 6 ہفتوں کے قیام پر محیط ہے۔ پہلے انھوں نے اپنے حالات سفر کو یاداشت کے طور پر روز ناچے کی شکل میں قلم بند کیا اور بعد میں دوست واحباب کے مشورے پر مرتب کر کے سفرنامے کی شکل میں 2014 میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔ اس سفرنامے میں موریشس کے تاریخی حالات، سیاسی پس منظر، تہذیبی وثقافتی صورت حال کے ساتھ ساتھ مختلف شعبۂ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انھوں نے سادہ لب ولہجہ اور سیدھے انداز بیان میں موریشس کے سفر کے احوال بیان کیے ہیں۔ دوران سفر پیش آئے واقعات کو چھوٹے چھوٹے جملوں کی مدد سے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ موریشس کے تاریخی وسیاسی حالات کے ذکر کے علاوہ ہندوستان کے سیاسی وتاریخی حالات کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سفرنامے میں انسانی محبت، خلوص، دلکشی اور فطری مناظر سے ہم آہنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس سفرنامے میں دردانہ قاسمی نے ان لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے ان کو علمی وادبی اعتبار سے شناسائی ہے اور جن لوگوں نے اس سفر میں ان کا ساتھ دیا ہے۔ اس سفرنامہ کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ موریشس میں دوسرے ممالک سے جا کر بسنے والوں میں سب سے زیادہ تعداد ہندوستانی تاجرین کی ہے۔ بعض مقامات پر دردانہ قاسمی نے ہندوستان اور موریشس کی طرز زندگی کا تقابل کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ موریشس کی بیشتر آبادی میں ہندوستانی کلچر اور رہن سہن کی جھلک ہے۔ مصنفہ کو موریشس کے لوگوں کی طرز رہائش نے کافی متاثر کیا ہے۔

□□□

Aamir Abbas
Research Scholar
University of Kashmir
Hazratbal, Srinagar-190006 (J & K)
Mob: 7006737397
Aamirabasslone621@gmail.com

عنب شمیم

سعیدہ بانو کی خودنوشت

'ڈگر سے ہٹ کر'

ایک مطالعہ

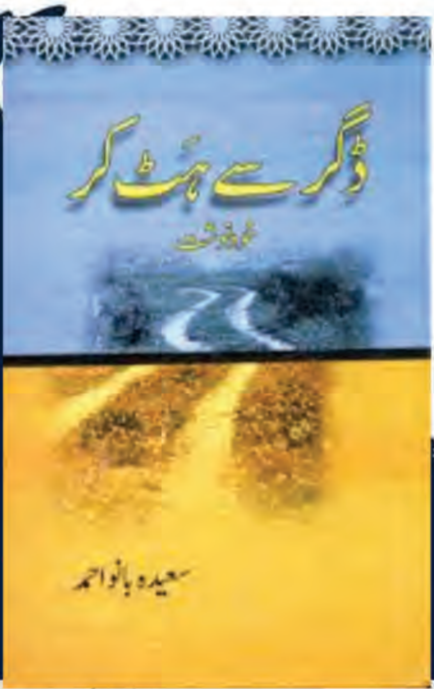

اردو ادب کی تاریخ میں بعض خواتین ایسی ہیں جن کا ذکر لیے بغیر تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ویسے تو اردو ادب کی بیشتر اصناف میں ایسی خواتین موجود ہیں، لیکن خودنوشت سوانح نگاری کے باب میں خواتین نے کئی اعتبار سے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کے ذریعہ لکھی گئیں خودنوشت سوانح حیات نسائی اور تانیثی نقطۂ نظر سے بھی دیکھے اور پرکھے جانے کا تقاضا کرتی ہیں۔ ان تصنیفات کے مطالعے سے انسانی معاشرے کے ایک مختلف پہلو سے آشنائی ہوتی ہے۔ یہ عورتوں کے معصوم جذبوں ہی کا اظہار نہیں، بلکہ عزم، ہمت اور استقلال کی زندہ کہانیاں ہیں، جن سے صرف نظر کر کے کسی بھی معاشرے کی ادبی و تہذیبی صورت حال کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اردو کی خواتین خودنوشت نگاروں میں ادا جعفری (جو رہی سو بے خبری رہی)، صالحہ عابد حسین (سلسلۂ روز و شب)، کشور ناہید (ایک بری عورت کی کتھا) اور سعیدہ بانو (ڈگر سے ہٹ کر) کے نام اہم ہیں۔

سعیدہ بانو کی آپ بیتی ''ڈگر سے ہٹ کر'' سجاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی کی جانب سے 1996 میں شائع ہوئی۔ یہ ایک پُراعتماد اور باہمت عورت کی کہانی ہے، جس نے اپنی زندگی کے سرد و گرم فاصلوں کو بہت حوصلے سے طے کیا۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی گھٹنے نہ ٹیکے، ہار نہ مانی۔ یہ آپ بیتی بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

''قصۂ پارینہ'' کے عنوان سے قائم کیے گئے پہلے باب میں سعیدہ بانو ہندوستان کی قدیم طرز تہذیب، اپنے والدین کی شادی، والدین کا بھوپال میں قیام اور پھر اپنی تعلیم و تربیت بھوپال کی آرام و آسائش بھری پرسکون زندگی، وہاں کی بیگمات اور پھر والد کے استعفی دے کر لکھنؤ منتقل ہونے تک کے احوال کا ذکر کیا ہے۔ سعیدہ قدیم طرز تہذیب کا ذکر کرتی ہیں کہ پہلے کے دور میں سفر کرنا کتنا مشکل تھا۔ لوگ پالکی میں سفر کرتے تھے اور آگے پیچھے کہار چلتے رہتے تھے تا کہ راستے میں نالی، گڈھا یا پلیا وغیرہ کی نشاندہی کرتے رہیں۔ اس قدر سستا وقت تھا کہ ایک ملازمہ کی تنخواہ آٹھ آنے مہینہ ہوتی تھی۔ یہ

1888 سے 1885 کی بات ہے۔

"خودنوشت کے مطالعے سے یہ بھی اندازا ہوتا ہے کہ سعیدہ بانو کے مزاج میں شوخی، ڈھٹائی، تیزی اور کھلنڈرا پن تھا۔وہ اپنی بہن سے بارہ سال اور بھائی سے چھ سال چھوٹی تھیں اس لیے اکثر اپنی حرکتوں کی وجہ سے دونوں کی ڈاٹ ڈپٹ اور تنبیہ کا نشانہ بنتی تھیں۔انھوں نے کبھی بھی بھائی بہن کی ڈانٹ ڈپٹ کی وجہ سے ان سے بحث نہیں کی لیکن ان کی باتیں بھی نہیں مانتی تھیں۔ 1919 میں سعیدہ کی بہن عالیہ خاتون کی شادی لکھنؤ کے صاحبزادے سید علی ظہیر سے ہو گئی جس کا انھیں دھندلا سا خاکہ یاد رہ گیا۔"

سعیدہ نے اپنی سوانح میں اس بھوپال کا ذکر کیا ہے جہاں پشتوں سے عورتوں کی حکمرانی تھی۔جب سعیدہ بھوپال میں تھیں اس وقت بیگم سلطان جہاں کی حکومت تھی۔بیگم سلطان جہاں مصلحت پسند، دوراندیش اور عورتوں کی ترقی کی فکر رکھنے والی خاتون تھیں۔ انھیں یہ فکر تھی کہ عورتوں کو جلد از جلد جہالت کے دلدل سے نکالیں۔ ان کی تعلیم و تعلم کا انتظام کریں اور قید و بند کی زندگی سے انھیں آزاد کریں۔بیگم سلطان جہاں نے عورتوں سے متعلق اپنے کسی بھی حکم کو نافذ کرنے میں زور زبردستی نہیں کی بلکہ وہ بہت سلیقے سے اپنی بات کے لیے لوگوں کو قائل کرتی تھی۔بھوپال کی تہذیبی فضا وہاں کے ماحول اور رہن سہن اور ایک خاتون کی حکومت نے سعیدہ کو بہت متاثر کیا تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

> یہاں ایک آزاد فضا تھی جس میں قدرتی خوبصورتی اور دلفریب مناظر تھے اور انسان کی بنائی ہوئی عمارتیں بھی تھیں جو اس زمانے کے رہن سہن پر روشنی ڈالتی تھیں۔صدر منزل محل اتنا بڑا تھا کہ کم سے کم بیس پچیس خاندان ایسے آرام سے
> رہ سکتے تھے کہ کسی کو کسی کی خبر نہ ہو۔رہائشی کمرے، آنگن، باورچی خانہ، شاگرد پیشے، غسل خانے وغیرہ اگر اس کہ ایک مکان میں تمام رہائشی فراغتیں مہیا تھیں اور ساتھ ہی ہر گھر ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہوئے بھی ایک الگ مکان تھا۔جس میں خاندان کی آزادی میں خلل نہیں پڑتا تھا۔
> عالی منزل کی عمارت میں خواتین کا کلب تھا جس سے ملحق بچوں کے کھیلنے کے لیے ایک بڑا باغ تھا۔درختوں میں جھولے پڑے تھے اور بچوں کی تفریح کے اور جملہ سامان بھی جمع تھے۔1

خودنوشت کے مطالعے سے یہ بھی اندازا ہوتا ہے کہ سعیدہ بانو کے مزاج میں شوخی، ڈھٹائی، تیزی اور کھلنڈرا پن تھا۔وہ اپنی بہن سے بارہ سال اور بھائی سے چھ سال چھوٹی تھیں اس لیے اکثر اپنی حرکتوں کی وجہ سے دونوں کی ڈاٹ ڈپٹ اور تنبیہ کا نشانہ بنتی تھیں۔انھوں نے کبھی بھی بھائی بہن کی ڈانٹ ڈپٹ کی وجہ سے ان سے بحث نہیں کی لیکن ان کی باتیں بھی نہیں مانتی تھیں۔1919 میں سعیدہ کی بہن عالیہ خاتون کی شادی لکھنؤ کے صاحبزادے سید علی ظہیر سے ہوگئی جس کا انھیں دھندلا سا خاکہ یاد رہ گیا۔

خودنوشت کا دوسرا باب ''دہلر کا لکھنؤ'' کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس کے مطالعے سے لکھنوی تہذیب اور اس وقت کی سیاسی و ادبی صورت حال کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔سعیدہ نے لکھنؤ کے دورخ دیکھے جسے انھوں نے بیان کیا ہے ایک تو وہ لکھنؤ جس میں بظاہر پرسکون اور عیش پرستی کی زندگی تھی بغیر انجام کو سوچے سمجھے۔دوسرا وہ لکھنؤ جہاں لوگ انگریزوں کی تہذیب ان کے رہن سہن پڑھنے لکھنے اور نظم وضبط سے کافی متأثر تھے۔خواتین ان میں پیش پیش تھیں۔ان کے اندر آزاد و روشن فضا میں سانس لینے کا جذبہ پیدا ہوا۔انھوں نے آوازیں اٹھائیں کہ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں، خصوصاً انگریزی تعلیم۔پھر ایک بڑی تعداد میں ہندوستانی عورتوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور نمایاں شخصیات بن کر ابھریں۔رانیوں مہارانیوں، بیگمات اور اونچے گھروں کی بیویوں کے بھی انگریز عورتوں سے تعلقات بڑھنے لگے۔یہ خواتین بھی دھیرے دھیرے مغربی تہذیب سے متاثر ہوئیں۔

کچھ بزرگ اور باہمت خواتین کا یہ خیال تھا کہ وہ پردے میں رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ان خواتین نے (Lucknow women's association) کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی جس کا ذکر سعیدہ بانو نے کیا ہے۔ زمانے کی بدلتی کروٹوں کے ساتھ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے پردہ غائب ہوا اور عورتیں مغربی تہذیب میں گھل مل گئیں۔

"کتاب کا ایک باب بعنوان "بڑی کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی" قائم کیا گیا ہے۔ اس باب میں سعیدہ نے بیٹے کی ولادت اور ایک ماں کے تجربے کو بیان کیا ہے۔ ایام حمل کے مسائل اور دیگر جزئیات اس باب کا حصہ ہیں۔ اسی طرح "کاشانۂ رضا" اور ا" ناگہانی آفت" کے ابواب میں انھوں نے ایک مکان کی تعمیر اور اپنے خاوند کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ایک عورت کے صبر وتحمل اور ایثار کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ سعیدہ کی تحریر سے ایک حوصلہ مند، پرعزم اور حالات کا ڈٹ کر سامنے کرنے والی عورت سامنے آتی ہے۔"

خودنوشت کا تیسرا باب 'پیا کا گھر' ازدواجی زندگی کے مسائل پر مشتمل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک خاتون مختلف مزاج شوہر کے سبب کن مشکلات کا سامنا کرتی ہے۔ ان مسائل کے بیان میں کے یہاں کئی رنگ نمودار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے شوہر کی شنرا کی نظر آتی ہیں تو کبھی اس سے حد درجہ محبت کرنے والی۔ سعیدہ کو بعد میں یہ بھی احساس بھی ہوا کہ انھوں نے شادی کے ابتدائی دنوں میں اپنے شوہر کے ساتھ جو سلوک کیا وہ غلط تھا۔ اس پر انھوں نے شرمندگی کا اظہار بھی کیا ہے۔ لیکن ان تمام حرکتوں کی ذمہ داری انھوں نے رسم ورواج پر ڈال دیے جہاں ایک لڑکی سے بن پوچھے اس کی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی جاتی ہے اور دو لوگ ایک دوسرے کو سمجھ ہی نہیں پاتے۔ کچھ دنوں بعد سعیدہ کو یہ اندازہ ہوا کہ صرف انہی کے ساتھ نہیں بلکہ گھر کے تمام لوگوں کے ساتھ ہی ان کا یہی رویہ ہے۔ وہ اپنی والدہ سے بھی ناراض ہو جاتے تو مہینوں بات نہ کرتے تھے۔ کبھی ناراض ہو جاتے تو کھانا بھی نہیں کھاتے اور کوئی ان سے پوچھتا بھی نہ تھا۔ ان کے اس چڑچڑے رویے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی تنخواہ باقی بھائیوں کے مقابلے میں کم تھی دوسرے بھائی بڑے عہدوں پر فائز تھے اس لیے گھر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ ایک عورت جب حاملہ ہوتی ہے تو اس وقت وہ اچھے رویے کی متحمل ہوتی ہے لیکن سعیدہ کے شوہر میں عورت کی حساسیت کا بالکل بھی خیال نہیں تھا جس کی وہ ہر جگہ شاکی ہیں۔ سعیدہ کے سسر جسٹس محمد رضا کا 1934 میں انتقال ہو گیا جس کا خاندان پر گہرا اثر پڑا اس انتقال کی انھوں نے تفصیلی روداد بیان کی ہے۔

کتاب کا ایک باب بعنوان ''بڑی کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی'' قائم کیا گیا ہے۔ اس باب میں سعیدہ نے بیٹے کی ولادت اور ایک ماں کے تجربے کو بیان کیا ہے۔ ایام حمل کے مسائل اور دیگر جزئیات اس باب کا حصہ ہیں۔ اسی طرح ''کاشانۂ رضا'' اور ا'' ناگہانی آفت'' کے ابواب میں انھوں نے ایک مکان کی تعمیر اور اپنے خاوند کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ایک عورت کے صبر وتحمل اور ایثار کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ سعیدہ کی تحریر سے ایک حوصلہ مند، پرعزم اور حالات کا ڈٹ کر سامنے کرنے والی عورت سامنے آتی ہے۔ وہ حالات سے گھبراتی نہیں ہے بلکہ سوچ سمجھ کر مسائل کے حل کے لیے تدبیر نکالتی ہے۔ راستے میں جو بھی مصیبتیں اور پریشانیاں حائل ہوں وہ اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔

کتاب کا ایک باب ''دوراہے پر'' ایک صبر آزما مرحلے کی داستان ہے۔ اسی باب میں انھوں نے ہندوستان اور اپنی مٹی سے محبت کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ زندگی نے ان کے سامنے دو راستے پیش کیے لیکن انھوں نے اس راستے کو اختیار کیا جس کا تعلق سچی وطن دوستی سے ہے۔ خودنوشت میں اس تعلق سے ان کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ لکھنو کی آرام دہ زندگی کو چھوڑ کر انھیں بہت سے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ دہلی میں سعیدہ کا قیام اقبال حسین کے گھر ہوا۔ سعیدہ کے گھر والوں سے پرانے تعلقات تھے۔ ان کی بیوی بیگم اقبال حسین ایک ملنسار خاتون تھیں۔ وقت اچھا گزر رہا تھا، لیکن یہاں

بھی ایک دشواری آ گئی۔ اقبال حسین بھی پاکستان جا رہے تھے۔ بیگم اقبال نے انھیں پاکستان جانے کی اطلاع دی اور سعیدہ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن سعیدہ نے صاف انکار کر دیا۔ وہ لکھتی ہیں:

یکا یک ذہن میں ایک بجلی سی کوندی۔ نہیں سعید میرا بچہ کہیں نہیں جائے گا۔ اگر مرنا ہے تو میرے کلیجے سے لگ کر ہی مریں گے ہم دونوں۔ خانم کی جان کی میں ذمہ دار ہوں اور رہوں گی آخر دم تک" یہ سب کچھ پلک جھپکتے مجھ پر گزر گئی اور میں نے بیگم اقبال سے کہا کہ نہیں، ہماری فکر نہ کیجیے ہم پاکستان نہیں جائیں گے۔2

" سعیدہ بانو نے ریڈیو کے کاموں کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ھے۔انھوں نے ریڈیو کے ذریعے ھندو پاک کی تھذیبی جڑوں کو جوڑنے کی کوشش کی۔ یہ ایک انوکھا پروگرام تھا جس میں ان کی خوب پذیرائی ھوئی۔ سعیدہ بانو ھندوستان کی پھلی ایسی عورت تھیں جنھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں خبریں براڈ کاسٹ کی اور اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ 1968میں لندن میں ایک کانفرنس ھوئی جس میں سعیدہ کو بطور نمائندہ شریک ھونے کے لیے منتخب کیا گیا۔Working women's conference تھی۔ سعیدہ نے تین ھفتے لندن کا سفر کیا۔BBC سے انھوں نے دو مرتبہ ھندوستان کے بارے میں کچھ نشر بھی کیا اور انٹرویو بھی دیے۔ لندن سے بیٹے اسد کے پاس کویت گئیں اور پھر وھاں سے Syria کا سفر کیا۔"

ملک کے سنگین حالات، خوف حراس اور دہشت گردی کے ماحول میں بھی سعیدہ گھبرائیں نہیں انھوں نے اس ملک میں رہتے ہوئے مرجانے کو پسند کیا بہ نسبت اس کے کہ وہ ہجرت کر کے پاکستان جائیں۔

''رفیع احمد قدوائی اور ان کا گھر'' کے عنوان سے قائم کیے گئے باب میں سعیدہ نے رفیع احمد قدوائی کے گھر موجود پناہ گزینوں کے حالات کا ذکر کیا ہے۔ اس تعلق سے ان کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رفیع احمد صاحب صاف دل انسان تھے۔ ان کے ہاں جو بھی جان بچانے اور پناہ حاصل کرنے آیا مایوس نہیں ہوا۔ سعیدہ نے اس باب میں کئی اہم سیاسی لیڈران اور شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ 30 جنوری 1948 کو گاندھی جی کے قتل کی خبر ملی۔ ملک میں ایک ذہنی انتشار کا ماحول پیدا ہو گیا۔ سعیدہ سے ریڈیو میں گاندھی جی کے انتقال کی خبر پڑھنے کو کہا گیا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ گاندھی جی کے قتل سے مسلمانوں میں خوف وحراس بڑھ گیا تھا۔ اس وقت سعیدہ کے بھائی نے بھوپال سے انھیں خط لکھا کہ وہ یہاں آ جائیں لیکن انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ ماں باپ اور شوہر یہ ہی ایسی شخصیتیں ہیں جو بیٹی، بیٹے یا بیوی کی ذمہ داریاں عمر بھر پورا کر سکتے ہیں، تیسرا کوئی نہیں۔ چنانچہ یہ باب ان کی زندگی میں پیش آنے والے ایک اہم موڑ پر سخت فیصلے سے بھی واقف کراتا ہے اور اپنوں سے گہری محبت ویقین کا بھی نمونہ پیش کرتا ہے۔

''رو میں ہے رخش عمر'' کے تحت سعیدہ بانو نے زندگی کے بدلتے حالات کا ذکر کیا ہے۔ نور الدین دہلی شہر کے میئر بن گئے تھے۔ اس لیے ان کا سعیدہ کے یہاں آنا جانا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر آ جاتے تھے۔ سعیدہ کے چھوٹے بیٹے سعید بھی برسر روزگار ہو گیا تھا۔ اسے Indian Oil میں Sales Officer کے عہدے پر نوکری ملی تھی۔ اگست 1965 میں ہندوستان اور پاکستان میں جنگ کا اعلان ہوا۔ خودنوشت میں اس کا بھی ذکر ہے۔ اسی باب میں سعیدہ بانو نے ریڈیو کے کاموں کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ انھوں نے ریڈیو کے ذریعے ہندو پاک کی تہذیبی جڑوں کو جوڑنے کی کوشش کی۔ یہ ایک انوکھا پروگرام تھا جس میں ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ سعیدہ بانو ہندوستان کی پہلی ایسی عورت تھیں جنھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں خبریں براڈ کاسٹ کی اور اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ 1968 میں لندن میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں سعیدہ کو بطور نمائندہ شریک ہونے کے لیے منتخب کیا گیا۔ Working women's conference تھی۔ سعیدہ نے تین

ہفتے لندن کا سفر کیا۔BBC سے انھوں نے دومرتبہ ہندوستان کے بارے میں کچھ نشر بھی کیا اور انٹرویو بھی دیے۔لندن سے بیٹے اسد کے پاس کویت گئیں اور پھر وہاں سے Syria کا سفر کیا۔

''دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز'' کے عنوان سے قائم کیے گئے باب میں سعیدہ نے اپنی پوتی شمن کے داخلے کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ اسی باب میں اپنے شوہر نورالدین کی رحلت اور ان کے بغیر اپنی تنہائی کا ذکر بھی شدت سے کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں۔

> 1950 کی بات ہے کہ جب میں نورالدین سے ملی تھی اس وقت سان و گمان بھی نہیں تھا کہ زندگی مجھے کس موڑ پر لے جا رہی ہے۔ مجھے اپنے اور ان کے حالات کی ترجمانی کے لیے یہ شعر بہت موزوں لگتا ہے۔
>
> عشق کہتا ہے خموشی سے بسر ہو جائے
> درد کو ضد ہے کہ دنیا کو خبر ہو جائے
>
> اب نورالدین کے بغیر میری زندگی میں سونا پن آ گیا ہے لیکن ان گنت خوشگوار لمحات ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں تو میں مسکرا اٹھتی ہوں اور حافظ کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔
>
> ہر چند پیرو خستہ تن و ناتواں شدم
> ہر گہہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم

''غم جہاں کا حساب'' کے عنوان سے قائم کیا گیا باب کئی اعتبار سے اس خودنوشت کا حاصل اور اختتامیہ معلوم ہوتا ہے۔اس باب میں سعیدہ نے پے در پے کئی لوگوں کے انتقال کا ذکر کیا ہے۔ 1975 میں سعیدہ کے بھائی کا انتقال ہو گیا۔31 دسمبر 1975 کو سعیدہ نے اپنی پوتی چنو کے ساتھ مسقط کا سفر کیا۔وہاں سے بحرین اور امریکہ کے لیے روانہ ہوئیں۔اور پھر 1978 میں دہلی واپس آئیں۔سعیدہ کے بھانجے کا 26 سالہ بیٹا نبی نویں منزل سے گر کر فوت ہو گیا۔اس سے انھیں دلی و جذباتی لگاؤ تھا۔سعیدہ نے اسی کے انتقال کے ذکر پر اپنی خودنوشت کو اس شعر کے ساتھ ختم کیا ہے:

> تم سے بچھڑ کر زندہ ہوں
> جان بہت شرمندہ ہوں

اس طرح سعیدہ بانو کی خودنوشت ''ڈگر سے ہٹ کر'' ان کی مکمل زندگی کی کہانی بیان کرتی ہے۔سعیدہ کا بچپن اور لڑکپن بھوپال میں گزرا اس لیے بھوپال کی ادبی و تہذیبی فضا بھی خودنوشت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔انھوں نے لکھنؤ سے تعلیم حاصل کی اپنی شادی کے بعد کی زندگی لکھنؤ میں گزاری اور شادی کے بعد لکھنؤ ریڈیو سے منسلک رہیں۔لہٰذا لکھنؤ کی تہذیبی فضا، وہاں کے مردوں اور عورتوں کے رہن سہن اور طرز معاشرت کا ذکر بھی خودنوشت میں تفصیل سے موجود ہے۔جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ تقسیم وطن کے وقت وہ لکھنؤ سے دہلی آ گئیں تھیں، لہٰذا اس وقت کے ملکی حالات، خلفشار، فرقہ وارانہ فسادات، خاندانی انتشار، جذباتی کشمکش اور ان جیسے بے شمار مسائل کا ذکر بھی کتاب میں موجود ہے۔لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''ڈگر سے ہٹ کر'' سعیدہ بانو کی ذاتی زندگی کی کہانی نہیں بلکہ بھوپال، لکھنؤ اور دہلی کی چار سے پانچ دہائیوں پر محیط ایک مفصل روداد ہے، جس سے ان مقامات کی ادبی، سماجی و تہذیبی جھلکیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ان مسائل کے بیان میں سعیدہ بانو نے خوبصورت نثری اظہار کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔بعض مقامات پر ان کی تحریروں میں موجود جذباتی پہلو ایک ہمدرد اور جفاکش خاتون کی مثال بھی پیش کرتا ہے۔لیکن ان کی جذباتیت حقائق کے بیان میں حائل نہیں ہوتی۔ سیاسی و تہذیبی مسائل کے بیان میں انھوں نے جرأت اور بے باکی کا بھی اظہار کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خواتین کی خودنوشتوں میں اس خودنوشت کا ایک منفرد مقام ہے۔

حوالے:

1 ڈگر سے ہٹ کر، ص 13-14

1 ڈگر سے ہٹ کر، ص 148

□□□

Enab Shamim
Research Scholar
Jamia Millia Islamia, New Delhi
H99-A, Second Floor
Babar Street, Muradi Road
Near PNB ATM,
Batla House, Okhla, New Delhi-110025
E-mail.enabshamim@gmail.com

محمد ارشد

اردو ادب کی اہم خواتین افسانہ نگار

اردو ادب میں خواتین کی حصہ داری بہت تاخیر سے ہوئی ہے۔ یہ اس عہد کی بات ہے جب سر سید اور ان کے نامور رفقا تعلیمی مشن پر گامزن تھے تو ڈپٹی نذیر احمد بچوں کی اصلاح کی غرض سے 'مراۃ العروس' اور خواجہ الطاف حسین حالی 'مجالس النسا' کے ذریعے بیداری کی لہر پیدا کر رہے تھے۔ ہر طرف مخالفتوں اور پابندیوں کے باوجود مرد و زن کے لیے اسکول و کالج کھلنے لگے۔ خواتین کے لیے مختلف جگہوں سے میگزین اور رسالے نکلنے شروع ہوئے، جن میں علامہ راشد الخیری کا نام کافی اہم ہے کہ انھوں نے نامساعد حالات سے ٹکراتے ہوئے اپنی تمام تر تصانیف کا موضوع عورتوں کے مصائب و آلام پر مرکوز رکھا، اسی وجہ سے انھیں مصورِ غم بھی کہا گیا ہے مزید برآں یہ کہ انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم و دیگر فنون کی غرض سے ''عصمت'' (دہلی) جاری کیا۔

علامہ راشد الخیری نے مسلم بچیوں کی خیر خواہی کی غرض سے دست کاری اور دیگر فنون کے لیے 'سہیلی' اور 'جوہر نسواں' (دہلی) کے ذریعے سعی پیہم کی۔ وہیں 'خاتون' (علی گڑھ)، 'تمدن' (دہلی)، 'مخزن' (لاہور)، 'زمانہ' (کانپور)، 'شریف بی بی' اور 'تہذیب نسواں' جیسے رسائل نے مسلم خواتین کے ذہنوں میں بیداری پیدا کی۔ خواتین رفتہ رفتہ مضامین، افسانے، ناول اور دیگر فنون کی جانب توجہ دینے لگی۔ مذکورہ رسائل اس کے شاہد ہیں کہ ان میں پردہ نشیں خواتین جو نئی تعلیمی کرن سے آشنا ہوئی تھیں، انھوں نے کہانی نما افسانوں کی جانب توجہ دی۔

ہندوستان میں خواتین کے ذریعے لکھی گئی اردو کہانی (افسانہ) کی باقاعدہ ابتدا بیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی۔ ان کی ادبی تخلیقات میں ناول، افسانہ، مضمون، ترجمہ اور تصنیف و تالیف کو فروغ دینے میں خواتین رسالوں کا اہم کردار رہا ہے۔ ابتدائی دور کی خواتین کہانی کار اپنے ناموں کے اظہار میں ہچکچاتی تھیں۔ اس کی جگہ اپنے ناموں کے پہلے حرف کا استعمال کرتی یا پھر بنت فلاں، مسز یوسف اور بعض تو فرضی نام بھی رکھ لیتی تھیں۔

ابتدائی دور کے خواتین جن کی کہانیوں میں افسانے کی جھلک نظر آتی ہے ان میں ز۔ ب، عظمت النسا بیگم (پاؤں میں زنجیر)، سیدہ فضل فاطمہ بیگم، (فرزانہ بیٹی) وغیرہ ایسی کہانی کار ہیں جن کی کہانیوں میں دوسری شادی کے رواج پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔

1915 کے بعد ابتدائی افسانہ نگار خواتین میں عباسی بیگم،

آصف جہاں، انجمن آرا اور نذر سجاد حیدر کا نام سرفہرست ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خواتین قلمکار سے قبل چند افراد ہی افسانے کی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے جن میں راشدالخیری، علی محمود، وزارت علی، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، محمد علی، خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتح پوری وغیرہ ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے رومانیت کے زیر اثر کہانیاں تحریر کی ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں نے بھی ان لوگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے رومانویت کے زیر اثر پروان چڑھی۔

عباسی بیگم کو خواتین افسانہ نگاروں میں اولیت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں پردہ نشیں خواتین کا بھرپور ذکر ہے جسے وہ پرندوں کے پنجروں میں بند ہوجانے سے تشبیہ دیتی ہیں، وہیں انھوں نے اورنگ زیب کے سخت رویے پر بھی انگشت نمائی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں 'گرفتار قفس، ظلم یکساں' وغیرہ اہم ہیں۔ وہیں نذر سجاد حیدر جو بنت الباقر کے نام سے لکھتی تھیں۔ معروف ناول نگار اور مسلم خواتین کے مسائل کو اٹھانے میں پیش پیش رہی ہیں۔ خاص طور پر پردہ کے خلاف احتجاج بلند کرتی رہی ہیں اور تعلیم نسواں پر خوب زور دیا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ خون ارمان 1915 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 'نیرنگ زمانہ، حور صحرائی، بی مغلانی، شہید جفا اور جوگن' وغیرہ تخلیق کیں۔ آصف جہاں جن کا پہلا افسانہ 'شش و پنج' ہے، ان کے افسانوں کے موضوع میں آزادیٔ نسواں مقدم ہے۔ ان کے دیگر افسانوں میں 'مشق ستم، سالگرہ، ندامت اور عجلت بے جا' وغیرہ اہم ہیں۔ انجمن آرا اپنے افسانوں میں سماج کی تلخ حقیقت کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتی ہیں، ان کا افسانہ 'ریل کا سفر' سبق آموز ہے، جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اکیلی لڑکی ٹرین، بس یا کسی اور چیز کے ذریعے سفر کرنے میں کتنا ڈر محسوس کرتی ہے، اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔

مسز عبدالقادر 'سراج الاخبار' کے مالک معروف عالم فقیر محمد کی صاحب زادی تھیں۔ ان کا اصل نام زینب خاتون ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'لاشوں کا شہر اور دوسرے افسانے' کافی دلچسپ ہیں۔ ان کے افسانوں کا محور تاریخی مقامات وکھنڈرات، پراسراریت اور انسانی نفسیات پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں امریکی ناول نگار ایڈگرایلن پو کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دیگر افسانوں میں 'صدائے جرس، ارواحِ خبیثہ، ناگ دیوتا، سمادھ کے بھوت، اور راہبہ' وغیرہ اہم ہیں۔

حجاب امتیاز علی مشہور ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج کی شریک حیات تھیں۔ انھوں نے اپنی ماں عباسی بیگم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خوب افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں بھی پراسراریت اور مافوق الفطرت عناصر ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ 'میری ناتمام محبت' ہے۔ اس کے علاوہ 'فورسڈ لینڈنگ، ممی خانہ میں ایک رات، کہیا بوت کے آسیب زدہ جنگل، نارنگی کی کلیاں، صنوبر کے سایے' وغیرہ ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ زبیدہ زری، امت الوحی، سعیدہ اختر، خاتون اکرم، آمنہ نازلی، سعیدہ عبدل، خورشید اور نجمہ انوار الحق وغیرہ نے بھرپور افسانے لکھے اور اس روایت کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ابتدائی افسانہ نگاروں کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر خواتین نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں میں اصلاحی پہلوؤں کو فوقیت دی۔ اس کے زیر اثر انقلاب اور آزادی 'جدو جہد پر عمل پیرا ہوئے۔ 'انگارے' کے لکھنے والے افسانہ نگار مغربی علوم سے بہرہ ور تھے۔ مشرقیت سے گہری آشنائی تھی۔ اپنے عہد کے تقاضوں، سیاسی و سماجی اقدار سے بخوبی واقف تھے۔ یہ لوگ آزادی پسند تھے اور غلامانہ ذہنیت سے بیزاری ان کے خمیر میں تھی۔

'انگارے' کے ذریعے رشید جہاں باغیانہ ذہن کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل، ذہنی پسماندگی اور ان کی بے بسی کو بے نقاب کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ان کے افسانوں میں جذباتی لہر، نوجوانوں کی سرگرمی اور فوری ردّعمل نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں 'سودا، چور، وہ، ساس اور بہو، دلی کی سیر، مجرم کون' وغیرہ اہم ہیں۔

رشید جہاں کے بعد ترقی پسند خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیونکہ یہ تحریک انسانی زندگی کو 'ادب برائے زندگی' کے تحت جوڑنے اور ان کے اُتار چڑھاؤ کو بیان کرنے میں سبقت لے گئیں۔ اسی وجہ سے اردو کی تقریباً ہر صنف ادب کو متاثر کیا۔ ترقی پسندی کی جانب عورتوں کا رجحان دن بدن بڑھنے لگا اور حقیقت پسندی کا میلان

بڑھنے لگا۔اسی بنیاد پر خواتین نے جنسی اور نفسیاتی رجحانات کی جانب توجہ دی اور بھرپور افسانے لکھے۔

ترقی پسند خواتین افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی سرفہرست ہیں۔خواتین کے مسائل پر انھوں نے خوب لکھا ہے۔ناول اور افسانے میں متوسط طبقے کو موضوع بنایا ہے۔ان کی تحریروں کا موضوع نسوانی جنسیت،طبقاتی استحصال اور سماجی مسائل ہے۔ان کے نو افسانوی مجموعے ہیں۔جن میں 'کلیاں، چوٹیں، چھوئی موئی، ایک بات، دو ہاتھ، بدن کی خوشبو' وغیرہ ہے۔ان کے مشہور افسانوں میں 'لحاف، چوتھی کا جوڑا، کافر وغیرہ بہت اہم افسانے ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر، بانی ترقی پسند تحریک سجاد ظہیر کی اہلیہ ہیں۔یہ متحرک اور فعال شخصیت کی مالک تھیں۔ان کے افسانوں پر شوہر نامدار کی چھاپ مکمل طور پر نظر آتی ہے۔ان کے افسانوں میں اشتراکیت کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل،عوامی زندگی کوٹ کوٹ کر بھری پڑی ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ادب اور زندگی کے مابین راہ ہموار کرنے کی سعی کی ہے،جس میں وہ کامیاب نظر آتی ہیں۔ان کے افسانوی مجموعوں میں 'زرد گلاب، اور 'اللہ دے اور بندہ لے' اہم ہے۔ان کے اہم افسانوں میں 'نیچ،نگوڑی چلی آوے ہے، معجزہ، بادشاہ، لاوارث' وغیرہ کافی چرچے میں رہے۔

ہاجرہ مسرور ایک کامیاب ترقی پسند افسانہ نگار تھیں۔انھوں نے عورتوں کے مسائل میں سیاسی، سماجی اور جنسیت کو موضوع بنا کر بڑی بے باکی کے ساتھ چیزوں کو بیان کیا ہے۔ان نے بھی عصمت کی طرح جنسی پہلوؤں کو بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ان کے تین افسانوی مجموعے 'ہائے اللہ، چوری چھپے، اندھیرے اجالے' ہیں۔اہم افسانوں میں 'بندر کا گھاؤ، کتے، چراغ کی لو، کوٹھی کوٹھری، کمینی' وغیرہ کے علاوہ جنسیات پر مبنی افسانے 'تل اوٹ پہاڑ، سرگوشیاں، کاروبار، لاعلاج' وغیرہ ہیں جس میں عورت کے احتجاج کی جھلک نظر آتی ہے۔

ان خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ شکیلہ اختر (پاسی بھات، کیڑے، لجیا، ڈائن)، خدیجہ مستور (افسانوی مجموعہ: کھیل، بوچھار، چند روز اور، تھکے پاؤں، ٹھنڈا میٹھا پانی' وغیرہ ہے۔ان کے مشہور افسانوں میں 'مینوں لے چلے بابلا لے چلے، خرمن، راستہ، فیصلہ سودا اور سہرا، وغیرہ)، صدیقہ بیگم (افسانوی مجموعہ میں 'ہچکیاں، آبادی سے دور، دودھ اور خون، پلکوں میں آنسو وغیرہ ہے۔مشہور افسانوں میں 'میری کہانی، تصویر، ہڈی کا داغ، کومل رانی، ٹھیکرے کی مانگ، بیمار، پرانا کوٹ' وغیرہ ہے) ان کے علاوہ ان گنت افسانہ نگار ہیں طوالت کے باعث نام پر اکتفا کرنا بہتر ہے جن میں اختر جمال، سلمہ صدیقی، (اہلیہ کرشن چندر)، تسلیم سلیم اور سرلا دیوی وغیرہ اہم افسانہ نگار ہیں۔ان میں بعض خواتین افسانہ نگاروں نے موضوعات کے سبب بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔

غلامی سے نجات، مزدوروں کے استحصال اور آزادی جیسے مسائل میں بھرپور کامیابی ملنے کے بعد دن بدن ترقی پسندیت کی رسّی ڈھیلی پڑنے لگی، جس کے سبب 1955 کے آس پاس نئی نسلوں کے ذریعے ایک نیا رجحان سامنے آنے لگا جو بالآخر 1960 میں اس کا نام جدیدیت قرار پایا۔

دراصل جدیدیت فرد کے داخلی جذبات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ قدیم سے انکار اور معاصر شعوری تقاضوں سے ہم آہنگی کا نام ہے۔اس رجحان کے تحت بہت سی خواتین جدیدیت کی حمایت میں اتریں اور پریم چند کے حقیقت پسند افسانوں جو حقیقت پسندی تھی، اس کی پُرزور مخالفت کی۔شمس الرحمٰن فاروقی جدیدیت کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ

> "نئے افسانہ نگار نے پریم چندی افسانے کو مسترد کر کے ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔اس نے بڑی قربانیاں دے کر یہ سبق سیکھا ہے کہ کردار محض ایک کھونٹی ہے جس پر کسی بھی قسم کا لباس ٹانگا جاسکتا ہے، لیکن پریم چندی افسانے سے اس کو ابھی پوری طرح خلاصی نہیں ملی ہے"

(نیا اردو افسانہ، ص 44، گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی دہلی، 1988)

جدیدیت کی علمبردار خواتین افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر سرفہرست نظر آتی ہیں گرچہ یہ رومان پسند ضرور تھیں لیکن غم زندگی اور غم کائنات کا درد بھی سمیٹے ہوئے تھیں۔ان کے افسانوں میں حیات انسانی کی کربناکی نمودار ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں

دوسری عالمی جنگ، جنگ آزادی اور تقسیم وطن جیسے انقلابات تاریخی تناظرات میں دکھائی دیتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے چھ افسانوی مجموعے ہیں جن میں 'ستاروں سے آگے، شیشے کے گھر، پت جھڑ کی آواز، روشنی کی رفتار، جگنوؤں کی دنیا' ہے۔ان کے افسانوں میں طبقۂ اولی کو خاص جگہ ملی ہے اور انھیں کو موضوع بنایا ہے جس سے ان کی ملاقات اور ان کی طرز زندگی سے واسطہ رہا۔ دیگر خواتین افسانہ نگاروں میں ممتاز شیریں بھی میں ممتاز ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں 'اپنی نگریا، میگھ ملہار' اہم ہے۔ان میں زیادہ تر افسانے ایسے ہیں جن میں مرد و خواتین کے جذبات اور ان کے آپسی تعلقات بہت ہی معنی خیز انداز میں نمودار ہوئے ہیں۔ان کے افسانوں میں 'انگڑائی، رانی اور شکست، گھنیری بدلیوں میں، کفارہ، آندھی میں چراغ، مجرم کون' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ جیلانی بانو کے پانچ افسانوی مجموعے ہیں، جن میں 'روشنی کے مینار، نروان، پرایا گھر، یہ کون ہنسا، سوکھی ریت' اہم ہے۔صالحہ عابد حسین ایک ایسی افسانہ نگار ہے جن کی تحریروں میں سچائی کا عکس خوب ہے لیکن ناقدین ان کی افسانہ نگاری کے مقابلے میں ان کی ناول نگاری کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔صالحہ عابد حسین اپنے افسانوں میں عورتوں کے حقوق کی بات کرتی ہیں۔گاندھی سے ان کی عقیدت خوب تھی اسی وجہ سے ان کے اکثر افسانوں میں ان کا ذکر خوب ہے، ان کی انسان دوستی ان کے افسانے میں خوب دکھتی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں 'نقش اول، ساز ہستی، نراس میں آس، نو نگے، درد و درماں، تین چہرے تین آوازیں' وغیرہ اہم ہیں۔

مسرور جہاں کی افسانہ نگاری اپنے وقت اور حالات کے پیش نظر بہت خوب تھی۔ان کے افسانوں کا موضوع عورت ہے۔عورتوں کے مسائل خاص طور پر بچپن سے لے کر عہد جوانی اور عہد جوانی سے لے کر بوڑھاپے تک کے احوال کو بڑے سلیقے سے اپنے افسانوں میں جگہ جگہ موضوع بنایا ہے۔عصمت چغتائی کے بعد مسرور جہاں نے خوب شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں 'چراغ پھولوں کے، دھوپ دھوپ سایہ، پرندے کا سفر، تیرے میرے دکھ' وغیرہ ہیں۔خود مسرور جہاں کو اپنے کئی افسانے پسند تھے، جن میں 'اللہ تیری قدرت' کے علاوہ مذکورہ افسانے بھی شامل ہیں۔

واجدہ تبسم خواتین افسانہ نگاروں میں اہم مقام رکھتی ہیں۔انھوں نے اپنے افسانے کا موضوع حیدرآباد شہر کے نوابوں کی عیش کوشی کو 'اترن' کے نام سے پیش کیا ہے۔مزید انھوں نے عورتوں کی جنسی ہوس پرستی کو بڑے فنکارانہ انداز میں برتا ہے، باقی عوامی مسائل بھی ان سے مخفی نہیں تھے۔ ہر موضوع کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ان کے افسانوی مجموعوں میں 'نتھ کا بوجھ، ہوا اوپر، نتھ اترائی، روزی کا سوال' وغیرہ قابل تحسین ہیں۔

مذکورہ خواتین افسانہ نگاروں نے جدیدیت کے زیر اثر اہم اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ان کے علاوہ بہت سارے افسانہ نگار جن میں جمیلہ ہاشمی، زاہدہ حنا، فہمیدہ ریاض، خالدہ حسین اور عائشہ صدیقی وغیرہ قابل قدر نام ہیں۔

جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت کا دور 1980 کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مابعد جدیدیت دراصل کوئی تحریک یا ردعمل نہیں ہے بلکہ ذہنی کشادگی کی راہ ہموار کرتے ہوئے ثقافت پر زور دیتی ہے۔اس میں موضوعاتی سطح اور ہیئتی سطح پر کافی تبدیلی پیدا ہوئی۔

خواتین افسانہ نگاروں میں کچھ ترقی پسندیت کی حامی اور کچھ جدیدیت کی پیروکار اور کچھ ان دونوں کی آمیزش میں غرق تھیں اور اب مابعد جدیدیت کا دور بھی شروع ہو چکا تھا۔خواتین افسانہ نگاروں میں کئی اہم نام ایسے بھی ہیں جو اسّی کے بعد سے لکھ رہی ہیں اور آج بھی ان کا قلم جاری ہے ان میں اکثر اکیسویں صدی کی پیداوار ہیں۔ان خواتین افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی کا نام کافی اہم ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'پرائے چہرے، تاریک راہوں کے مسافر' بیسویں صدی کے آخری دہائی کی تخلیقات ہیں۔اس کے بعد اکیسویں صدی میں دو دہائیوں کے مابین کئی مجموعے اشاعت پذیر ہوئے۔ان میں 'صدائے بازگشت، نقش ناتمام، یہ جہان رنگ و بو، آنکھن دیکھی' اہم ہے۔ ان کے افسانوں میں 'چرایا ہوا سکھ، جگنو، پرائے چہرے، کاغذی رشتہ، تاریک راہوں کے مسافر، میراث، لاٹھیوں والے، بھیڑیے، قشقہ، بلی کا بچہ' وغیرہ اہم ہیں۔

ترنم ریاض: ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں

سماجی احوال گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک کی آواز ان کے افسانوں میں گونجتی ہے۔ان کے افسانوں کے مجموعوں میں 'یہ تنگ زمیں،ابابیلیں لوٹ آئیں گی ،یمبرزل،میرا رخت سفر' ہے۔ان کے اہم افسانوں میں' کانچ کے پردے،نا خدا،ایک تھکی ہوئی شام،مہمان،باپ،بجھائے نہ بنے ،برف گرنے والی ہے،میرا پیا گھر آیا،یہ تنگ زمیں،حضرات و خاتون،چمگادڑ،آنسو'وغیرہ اہم افسانے ہیں۔

قمر جہاں: خواتین افسانہ نگاروں میں اہم پہچان بنانے والی خاتون ہیں۔ان کی افسانہ نگاری اسّی کے بعد ہی نکھر کر سامنے آئی، ان کے افسانوں میں بہار کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ان کے کئی افسانے ایسے ہیں جو قابل رشک اور قابل غور بھی ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماج کی حقیقت کو بیان کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ان کے افسانوی مجموعوں میں 'چارہ گر،اجنبی چہرے،پنجرے کا قیدی' اہم ہیں اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں آج کی عورت،ممتا کی خوشبو،اپنے ہوئے پرائے،جنت بھی جہنم بھی، کہانی ایک مزار کی،وہ لڑکی لمحوں کی صدا،خواب خواب زندگی،بے سود سفر،کٹی ہوئی شاخ،چادر کی شکن،کہانی ایک شب کی،سفر اور ہم سفر'وغیرہ اہم ہیں۔

نگار عظیم: عصر حاضر کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں میں زمانے کی ناہمواری اور انسان دوستی بخوبی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کے افسانوں کے مجموعوں میں 'عکس،گہن،عمارت' اہم ہے۔اور ان کے مشہور افسانوں میں 'مرد،اللہ میاں،ریڈ لائٹ،بابا،بیاہ،نوکری، دوسرا قتل،محافظ،سنگین جرم،گہن،نگینہ،حصار،مردار،فیملی،تعلق' وغیرہ اہم ہیں۔

غزال ضیغم: عصر حاضر کی اہم افسانہ نگار میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں گنگا جمنی تہذیب پیوست ہے مزید ان کے افسانوں میں زمیندارانہ ماحول بھی خوب نظر آتا ہے۔ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ایک ٹکڑا دھوپ کا' ہے۔اس میں ان کے افسانے 'سوریہ ونشی،نیک پروین،بھولے بسرے لوگ،چراغ خانہ درویش، خوشبو،زندہ آنکھیں مردہ آنکھیں،بے دروازے کا گھر،آڈ نمبر' وغیرہ اہم ہیں۔

ثروت خان: یہ بھی ہم عصر افسانہ نگار ہیں،انھوں نے گرچہ بہت کم لکھا ہے لیکن جو بھی لکھا ہے وہ ان کی شخصیت کو ابھارنے کے لیے کافی ہے۔اسی وجہ سے ان کا نام خواتین افسانہ نگاروں میں شمار ہو تا ہے۔ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ذرّوں کی حرارت' ہے۔افسانوں میں 'سمپرن،شکست و ریخت،وہ لاجواب تھی،محبت کا شجر،مردانگی ،ڈرائی ڈیکوریشن،چوتھا کھونٹ،حسن کا معیار،دو گز زمیں' وغیرہ اہم افسانے ہیں۔

اشرف جہاں: ان کا بھی شمار عصر حاضر خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے افسانے اور افسانچے میں خوب نام کمایا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے میں 'شناخت،اکیسویں صدی کی نرملا،اگر میں نا ہوتی،اور افسانچے میں 'اوقات،اپنے دور کا ماتم،شردھا،یہ سب اردو ہے،ایمان بچ گیا' وغیرہ اہم افسانچے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں 'موم کی مریم،شناخت،واپسی،صفحے زندگی کے بکھر گئے،فکر آگہی،احتساب،اجنبی ہوں،تمام عمر مسافر سفر میں رہتا ہے، نائن الیون،صحرا کا سفر،بے غم،کون ہو تم،کچھ مت سوچو،عیار دانش، کرب ناتمام،بس ایک سوال' وغیرہ اہم افسانے ہیں۔

مذکورہ خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ کچھ نام ایسے بھی ہیں جو ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ اہمیت کے حامل بھی ہیں ان میں عذرا نقوی،آشا پربھات،بلقیس ظفیر الحسن،تسنیم کوثر،شہناز کنول، عطیہ عابد،رفعت شاہین،شہیرہ مسرور وغیرہ ایسے نام ہیں جنھوں نے خواتین افسانہ نگاری کے ذیل میں اہم مقام حاصل کیا ہے اور فکشن میں اپنی تحریروں کے ذریعے بھرپور اضافہ کیا ہے۔

□□□

Dr.Md Arshad
Department of Urdu
Dyal Singh College,(Day)
(University of Delhi)
Lodhi Road, New Delhi-Pin 110003
Mail: mdarshad.urdu@dsc.du.ac.in
Mob: 9213307499

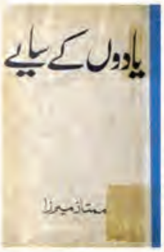

حنا آفریں

آزادی کے بعد ہندوستانی نسائی شاعری کے موضوعات

تحریکِ آزادی میں نہ صرف سیاسی رہنما زور وشور سے حصہ لے رہے تھے بلکہ ادبا اور شعرا بھی اپنی تخلیقات کے ذریعہ لوگوں کا حوصلہ بڑھانے میں پیش پیش تھے۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزی تعلیم کے لیے دلچسپی پیدا ہوئی اور ہمارے رہنماؤں نے تعلیمی اعتبار سے جو کوششیں شروع کیں ان سے لوگوں کے ذہن بیدار ہوئے۔ لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی زور دیا گیا۔ تعلیم نسواں نے انھیں غور وفکر پر مجبور کر کے ان کے ذہنی دریچوں کو وا کیا۔ اس کا اظہار وہ مختلف میدانوں میں کرنے لگیں جیسے گھڑ سواری، موسیقی اور شعر وادب وغیرہ۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جو بھی شاعرات منظرِ شاعری پر نظر آئیں ان کے کلام پر مقصدیت حاوی تھی لیکن ملک آزاد ہونے کے بعد ان کے موضوعات میں تنوع نظر آیا۔ اب وہ مختلف موضوعات پر اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کھل کر کرنے لگیں۔ آزادی کے بعد جو شاعرات تخلیقی ادب میں پیش پیش تھیں ان میں بیگم ممتاز جہاں مرزا، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، شفیق فاطمہ شعریٰ، جمیلہ بانو، مسعودہ حیات، بلقیس ظفیر الحسن اور رفیعہ شبنم عابدی وغیرہ ہیں۔

بیگم ممتاز جہاں مرزا کا شعری مجموعہ 'یادوں کے سایے' 1975 میں اشاعت پذیر ہوا۔ انھیں اپنی شعری خدمات کے صلہ میں 'پدم شری' اعزاز سے نوازا گیا۔ وہ روایتی شاعری سے متاثر تھیں لہٰذا ان کے لکھنے کا طرز بھی کلاسیکی تھا مگر اس کے باوجود موضوعات میں تنوع نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی اپنی شاعری میں کرتی ہیں۔ وہ مصیبتوں اور پریشانیوں سے تنگ آکر مایوس نہیں ہوتیں بلکہ ایک نئے حوصلے اور جوش کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ممتاز مرزا کے اشعار کی قرأت کے بعد قاری غم واندوہ کے اندھیروں میں نہیں جاتا ہے بلکہ اس پر فرحت ومسرت کا احساس قائم ہو جاتا ہے۔ جیسے

رات گنگناتی ہے، صبح مسکراتی ہے
پھر مرے تصور میں سایہ ہائے لرزاں ہیں
کتنا پیارا ہے جہاں، کتنی حسین ہے یہ حیات
یاس و اندوہ کے دریا سے گزار کر دیکھو
دل غم سے چور، لب پہ ہنسی، سر بلند ہو
کچھ اس طرح زمانے سے نظریں ملائیے

زندگی جہد مسلسل ہے ، ہراساں کیوں ہو
ولولہ جب کوئی مرتا ہے، تو ہنس دیتے ہیں

عام طور پر محبوب کی یاد آنے پر عاشق کے لیے دن ورات گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔دن کی روشنی اور رات کی تنہائی اسے ڈسنے لگتی ہے جب کہ پہلے شعر میں شاعرہ نے اس کے برعکس صورت حال بیان کی ہے کہ محبوب کے تصور میں ہی آنے سے عاشق کے لیے صبح مسکرانے اور رات گنگنانے لگتی ہے۔شاعرہ نے اس شعر میں صنعتِ تجسیم کے استعمال سے اپنی بات خوبصورت انداز میں بیان کی ہے۔

دوسرے شعر میں بیگم ممتاز مرزا لوگوں کو اس جانب متوجہ کرتی ہیں کہ یہ دنیا اور زندگی بہت خوبصورت ہے۔قدرت کی خوبصورتی کا نظارہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود کو زندگی کی ناامیدی اور دنیا کے غم واندوہ کے دریا سے نکال کر دیکھا جائے۔یہ ایسی جگہ ہے جہاں خوشی وغم لازم وملزوم ہیں۔غموں پر فتح حاصل کر کے خوشیوں کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

بیگم ممتاز مرزا اپنی شاعری میں روایتی عاشق کی مانند روتی بلکتی نظر نہیں آتی ہیں۔ان کے دل میں کتنا ہی غم کیوں نہ ہو، ہونٹوں پر ہنسی کھلکھلاتی رہتی ہے۔وہ خود بھی زندگی کا مقابلہ ہمت سے کرتی ہیں اور قارئین کو بھی حوصلہ دیتی ہیں۔تیسرے شعر میں قارئین کو ہمت وحوصلہ کے ساتھ زمانے سے نظریں ملانے کی تلقین کرتی ہیں۔چوتھے شعر میں زندگی کی جہد مسلسل کی جانب نشان دہی کی گئی ہے کہ اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔جب بھی شاعرہ کے دل میں شوقِ عشق کا ولولہ مرتا ہے تو وہ ہنس کر پھر سے اسے جینے کی وجہ دے دیتی ہیں۔ممتاز مرزا کے شعروں میں ہمیں ان کے جذبات کا اظہار ہی نہیں بلکہ حالاتِ حاضرہ کا درد بھی ان کے کلام میں بیان نظر آتا ہے۔اکثر جگہ وہ زندگی گزارنے کا ہنر سکھاتی ہیں۔

زاہدہ زیدی جن کی شاعری نہ صرف اپنی ذات کا اظہار ہے بلکہ اس وقت کے حالات کی ترجمانی بھی ان کی شاعری میں ملتی ہے۔جدیدیت پر مبنی ان کے کلام میں ترقی پسند تحریک کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔انفرادی تجربے نے انھیں صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کا تجربہ آفاقی تجربہ بن کر سامنے آیا۔انھوں نے اپنے کلام کے ذریعہ مظلوم کی آواز کو بلند کیا اور ظالم کے خلاف آواز اٹھائی۔'شامِ تنہائی' مجموعے میں شامل ان کی نظمیں جشنِ بربریت، فسانۂ دردِ بےزباں بےاہمیت کی حامل ہیں۔

زاہدہ زیدی کے شعری مجموعے زہرِ حیات ،سنگِ جاں اور شامِ تنہائی ہیں جو بالترتیب 1970، 1989 اور 2008 میں شائع ہوئے جن میں ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ان کی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہم نے طوفاں سے پیماں وفا باندھا ہے
کہہ دو ہر موجِ تلاطم سے مقابل ہو جائے

ذہن کی دھوپ تو ہے، درد کے بادل بھی یہی
بارشِ غم سے تو یہ اور نکھر جائے گی

چار سو کوچہ و بازار میں محشر ہے بپا
خوف سے لوگ نکلتے نہیں اپنے گھر سے

گر نہیں حوصلہ عشق تو پھر یونہی سہی
چلو ہم پھر سے بنے جاتے ہیں انجانے دو

پہلے شعر میں شاعرہ عشق میں ثابت قدم ہیں۔خواہ کتنی ہی مشکلیں، پریشانیاں کیوں نہ آئیں مگر وہ ہر طوفان سے مقابلے کے لیے تیار ہیں۔دوسرے شعر میں ان پر جدید رجحان حاوی ہے تبھی انھوں نے کیفیات کو مجسم بنا کر پیش کیا ہے۔ذہن کی دھوپ میں درد کے بادل اور غموں کی بارش کے ذریعہ محبت میں مزید نکھار پیدا کیا ہے۔محض نظموں میں ہی نہیں بلکہ غزلوں کے اشعار میں بھی ان کی اس تکلیف کو محسوس کیا جا سکتا ہے جس میں طبقاتی تفریق کے تحت خوف و دہشت کا ماحول گرم ہے۔اس کے سبب لوگ باہر نکلنے سے گریز کرتے ہیں۔اس حقیقت کو زاہدہ زیدی نے تیسرے شعر میں خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

چوتھے شعر میں شاعرہ نظم کرتی ہیں کہ عشق کی دشواریوں کو برداشت کرنے کے لیے اگر عاشق میں ہمت وحوصلہ نہیں ہے تو پھر

اسے انجان بننے میں کوئی برائی نہیں ہے۔

"اپنے کلام کے ذریعہ زاھدہ زیدی نہ صرف زندگی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے قارئین کو حالاتِ حاضرہ کی جانب متوجہ کرتی ہیں بلکہ زندگی میں پیش آنے والی چھوٹی چھوٹی باتوں کو کس طرح درگزر کرکے خوبصورت بنایا جاسکتا ہے اس کا گُر بھی سکھاتی ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زاھدہ زیدی کے کلام میں مختلف موضوعات کو دلکش پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔"

اپنے کلام کے ذریعہ زاہدہ زیدی نہ صرف زندگی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے قارئین کو حالاتِ حاضرہ کی جانب متوجہ کرتی ہیں بلکہ زندگی میں پیش آنے والی چھوٹی چھوٹی باتوں کو کس طرح درگزر کر کے خوبصورت بنایا جاسکتا ہے اس کا گُر بھی سکھاتی ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زاہدہ زیدی کے کلام میں مختلف موضوعات کو دلکش پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔

ملک آزاد ہونے کے فوراً بعد ہی تقسیم کا سانحہ بھی پیش آیا جس نے ہندوستانیوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ نہ صرف اقدار کی شکست وریخت ہوئی بلکہ انسان کا دل بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ انسان منتشر ہو تنہائی کا شکار ہوا، ہر شے پر سے یقین اٹھ گیا۔ ساجدہ زیدی کا حساس دل ایسے ماحول میں شاعری کر رہا تھا۔ لہٰذا اس کا اثر ان کے کلام پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے آتش زیرِ پا، جوئے نغمہ اور سیلِ وجود ہیں۔ ساجدہ زیدی فلسفہ 'وجودیت سے متاثر تھیں ۔لہٰذا ان کی نظموں پر یہ فلسفہ حاوی ہے۔

نظم 'وہ پل۔ یہ گھڑی' ساجدہ زیدی نے اپنے بیٹے سلمان کے نام لکھی ہے۔ اس میں بیٹے کی پیدائش سے لے کر جوان ہونے اور پھر گھر سے دور جانے کے بعد اپنے ہی گھر میں مہمان بن کر آنے کی بات کہی گئی ہے۔ اس میں اپنے بیٹے کے لیے ایک ماں کی تڑپ کا اظہار ہے۔ ماں وقت کی نزاکت کو سمجھ رہی ہے مگر اس کے باوجود بیٹے کی محبت پانے کے لیے بے چین ہے۔ اسی طرح 'کاغذی ہے پیرہن' میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے شاعرہ کا کرب محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں جہاں چہار جانب سیاست کا بازار گرم ہے۔ مصلحت کے تحت شناسا انسان بھی اجنبیت کا احساس کراتے ہیں۔ رشتے مصلحت کی آگ میں جل رہے ہیں جس کے سبب خوشی کے لمحے بے جان ہو گئے ہیں۔ یہاں اس دور میں جسم و جاں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ریاکار لوگوں کی محفلیں سجی ہوئی ہیں۔ نیک دل لوگوں کی آرزوئیں سبکسار ہو رہی ہیں۔ ساجدہ زیدی نے عشق کی مختلف کیفیات بھی اپنے اشعار میں بیان کی ہیں۔ اس قسم کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

غم کی بستی سے جو آتی ہے یہ رُک رُک کے صدا
شعلۂ عشق جو زندہ ہے تو دل زندہ ہے!
ہے تیری یادِ حسیں آج بھی محور دل کا
اور بھی نقش مگر دل میں ابھر آتے ہیں آج

پہلے شعر میں شاعرہ کے اداس دل سے یہ صدا آتی ہے کہ دل کے زندہ ہونے کا سبب شعلۂ عشق کا زندہ ہونا ہے۔ اگر عشق کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی تو یہ دل بھی مردہ ہو جائے گا۔ جب کہ دوسرے شعر میں برعکس صورت حال بیان کی ہے کہ دل میں محبوب کی یاد ابھی بھی باقی ہے مگر محبوب کے نقش کے علاوہ بھی دل میں اور نقش ابھرتے ہیں۔ پہلے شعر میں روایتی تصور ہے تو دوسرے شعر میں جدید صورت حال ہے۔

ساجدہ زیدی کی نظموں اور غزلوں میں عشق کی کیفیات کے ساتھ ساتھ تنہائی، شکست وریخت کا کرب، مادیت خواتین کا استحصال وغیرہ موضوعات اہم موضوعات ہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کا کلام مخصوص ذہن کے قارئین کا مطالبہ کرتا ہے جو سنجیدہ غور وفکر کا مالک ہو۔ اپنے مخصوص اسلوب کے سبب ان کی رسائی عام قارئین کی ذہنی سطح تک نہیں ہو پاتی۔ وہ اپنی پیش رو اور ہم عصر شاعرات سے مختلف کلام نظم کرتی ہیں۔ اس میں ان کی مخصوص لفظیات واسلوب کا عمل دخل ہے۔ یہ نہ صرف اسلوب کے اعتبار سے بلکہ موضوعات کے اعتبار سے بھی وسیع معلومات فراہم کرتی ہیں۔

شعریٰ بنیادی اعتبار سے نظم کی شاعرہ ہیں۔ نظم گو شاعروں میں اپنی منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ نظموں میں وہ اکثر اسلامی تاریخ کی مدد سے اپنے موضوعات کو شعری پیکر فراہم کرتی ہیں۔ شعریٰ اپنی نظموں میں تہذیبی عروج و زوال کا احاطہ کرتے ہوئے ماضی کی عظمتوں سے متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ شعریٰ کے شعری مجموعے آفاقِ نوا (1987)، گلۂ صفورہ (1990) اور سلسلۂ مکالمات (2006) ہیں۔

'آفاقِ نوا' مجموعے میں شامل نظم 'شہرِ نوا' میں جس طرح شعریٰ نے ایک شہر سے لگاؤ کا ذکر خوبصورت انداز میں کیا ہے اور ماضی کی باتوں کو یاد کیا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے:

اس گرد و نوا میں مہکی تھی/ وہ نغمہ بہ لب لالے کی کلی
پتّی پر لیٹی پتّی سرکاتی / آہستہ خرام سنہری دھوپوں میں
اک پوری رُت کا خم اُس کے/ امرت سے بھرا
ایک پوری رُت ڈنڈی ڈھلکانے/ پنکھڑیاں بکھرانے کو درکار ہوئی
سب چمن چمن گل حوض لبالب، رواں رواں/ اُفتادہ بظاہر سب
راہیں/ رہتی ہیں پیہم سرگرداں/ سب اگلے پچھلے یگ
سب بستے اجڑتے گاؤں، نگر/ شر نارتھی، نرواسی
پیہم دہراتے ہوئے/ وہ بیتی باتیں/ جن کا کوئی انت نہیں

اس نظم میں شاعرہ نے پہلے تو اپنے شہر کی تعریف کی ہے کہ جہاں چہار جانب سورج کی سنہری دھوپ میں لالے کی کلیوں کے چٹخنے کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے امرت سے بھری رُت وہاں چھائی ہوئی ہے۔ چمن سبز و شاداب، حوض پانی سے بھرے اور پیڑوں کے گھنے سایے جھوکوں کی صورت میں سکون بخشنے والے ہیں۔ بظاہر خراب راستے مگر جو ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں۔ یہاں ہر تھوڑے وقت کے بعد زمانہ اور حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ بستیاں اجڑتی اور بستی ہیں۔ دوسرے شہر کے رہنے والے لوگ بھی یہاں آکر قیام پذیر ہوتے ہیں اور لوگ کبھی ختم نہ ہونے والی گزری باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح شعریٰ کی نظموں میں شجرِ تمثال، کھیل رتوں کا اور رُت مالا وغیرہ اہم ہیں جن میں انھوں نے قدرت کی بنائی اشیا کی تعریف کرتے ہوئے سہانے منظر کا سماں باندھا ہے۔

شعریٰ کے دوسرے مجموعے 'گلۂ صفورہ' میں فصیل اورنگ آباد، ایلورہ، خلد آباد کی سرزمین، یاد نگر، مسافر پرندے، یادِ وطن، آزردہ قمری، مجذوب وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔

شعریٰ کی نظموں میں ماضی کی یاد، اپنے ملک و شہر سے محبت، موسموں کا ذکر، مجذوب کا تذکرہ، قفس میں قید پرندوں کی معصوم بے بسی وغیرہ مختلف موضوعات کو شاعری کا حصہ بنایا گیا ہے۔ جدید شاعرات میں رفیعہ شبنم عابدی کا نام بھی خصوصیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات میں بھی تنوع دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ذات کے کرب کے ساتھ ساتھ سماجی اور عصری واقعات نظم کیے ہیں۔ نسائی حسیت کی کارفرمائی بھی ان کی غزلوں اور نظموں میں موجود ہے۔ ان کی شاعری محض حسن و عشق کی داستان نہ ہو کر ایک پختہ ذہن اور فکر کا احساس کراتی ہے۔

ان کے شعری مجموعے موسم بھیگی آنکھوں کا (1985)، اگلی رُت کے آنے تک (1994) اور آنگن آنگن پُروائی (2009) ہیں۔ ان کی غزلوں سے منتخب اشعار دیکھیے:

اسے تو ایک نظر کی بھی تھی کہاں فرصت
وہ جس کے واسطے سولہ سنگار کرنا تھا
اتنا ہر چیز کے رکھنے کا قرینہ تھا تجھے
مجھ کو پہلو میں رکھا، ذہن میں رکھا اُس کو
تم چپ بیٹھو تم عورت ہو، تم کیا سمجھو بات مری
ایک ہی پل میں آن کے رکھ دی یوں اس نے اوقات مری

ان تینوں اشعار میں رفیعہ شبنم عابدی کی شاعری کی ہندوستانی عورت دکھائی دیتی ہے جو اپنے شوہر کے لیے سولہ سنگار کرنا چاہتی ہے مگر صنعتی اور میکانکی دور نے انسان کو اتنا مادیت پرست بنا دیا ہے کہ وہ رشتوں ناطوں سے بھی دور ہو گیا ہے۔ مصروفیت کے باعث اور جذبات سے عاری انسان کے پاس اپنے ساتھی کو بھی ایک نظر دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ دوسرے شعر میں شاعرہ کے اس کرب کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ساتھ رہنے کے باوجود محبوب کے دل و دماغ پر کوئی اور چھایا رہا۔ تیسرے شعر میں دل کا درد احتجاج کی صورت میں نظر آیا ہے کہ عورت ہونے کے سبب کسی بھی مسئلہ پر اس کی مرضی معلوم نہ کر کے اسے خاموش کر دیا جاتا ہے۔ ان تینوں اشعار میں ہندوستانی

عورت کی تصویرکشی ہے۔

غزلوں کے اشعار کی طرح رفیعہ شبنم عابدی کی نظموں میں بھی تنوع ہے۔'بابل جیسا اک سایہ' نظم میں ماں کی عظمت بیان کی ہے۔ 'سالِ نو' نظم میں شاعرہ نئی نسل کو نئے سال کی خوشی منانے کے ساتھ اس بات کی بھی تلقین کر رہی ہیں کہ گزرے دنوں کے ان مانوس لمحوں کو مت بھولنا جن کی زندگی تمہارے بغیر دشوار ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رفیعہ شبنم عابدی کی شاعری میں نہ صرف ذات کا کرب بیان ہوا ہے بلکہ عصر حاضر کے مختلف مسائل بھی ہیں۔ ہندوستانی عورت کی تصویرکشی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب بھی جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔

جدید شاعرات کے کلام کے مختصر جائزے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آزادی کے بعد کی شاعرات نے مقصدی شاعری نہیں کی بلکہ ذات کے کرب کے ساتھ ساتھ ازدواجی زندگی کی الجھنوں، سماجی اور عصری مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ وہ تمام رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا ہے۔ یہ تنہائی کا احساس بھی ان کی شاعری میں ہے۔ انھوں نے مشکل تشبیہوں، علامتوں، غیر مانوس ترکیبوں کے علاوہ سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔

Dr. Hina Afreen
Assistant Professor,
Academy of Professional Development of Urdu medium Teachers,
Jamia Miliia Islamia,
New Delhi-110025
hinagufran123@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر .... بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

نیلوفر فردوس

سماج کے مختلف شعبوں میں خواتین کی حصے داری

جب سے دنیا بنی ہے اس وقت سے لے کر اب تک عورت بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے اور ہمیشہ بنی رہے گی۔ اس کی شخصیت کی دلکشی اور رنگا رنگی کو سمجھنا انسانی دماغ کے لیے مشکل ترین کام ہے۔ پہاڑوں کی پائے داری، سمندر کا سکوت، صحراؤں کے طوفان اس کی فطرت کا حصہ ہیں۔ عورت کی قربانیوں پر ہی انسانی نسل کی بقا منحصر ہے۔ زندگی کی مشکلوں، مصیبتوں اور پریشانیوں میں اس کا سوز جگر اور جذبۂ ایثار اپنے آپ میں مثال ہے۔ پھر بھی تاریخ گواہ ہے کہ عورت ہر دور میں مردوں کے استحصال کا شکار رہی ہے۔ کچھ صورتوں میں عورت خود عورت کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ 8 مارچ 1910 سے آج تک بین الاقوامی طور پر عورتوں کا دن Womens Day منایا جاتا ہے۔ آج سو سال بعد جبکہ عورت سماج کے مختلف شعبوں میں اپنی کامیابی کے پرچم لہرا چکی ہے۔ میڈیکل، قانون، انجینیئرنگ یا سیاست کوئی بھی میدان ہو اس کے بغیر ادھورے ہیں۔

عورت پھر بھی آج پورے طریقے سے محفوظ نہیں ہے۔ کہیں وہ خود ذمہ دار ہے تو کہیں سماج۔ عورت روز نئے ظلم وستم کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ زنا بالجبر کے قصے روز سنائی دیتے ہیں۔ عورت ہر روز نئے طریقے سے بے آبرو کی جاتی ہے۔ کہیں کال گرل ہے تو کہیں ماڈل، کہیں سستی چیزوں کا اشتہار ہے تو کہیں سامانِ عیش۔ دراصل عورتوں کو کمزور، کمتر، حقیر اور قابل استعمال اور استحصال نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ انسان سمجھنا چاہیے۔ ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جو انسانی نقطۂ نظر سے صحیح ہو۔ یہ جذبہ ہونے پر ہی عورتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک ممکن ہے۔ بغیر اس جذبہ کے کوئی بھی سماج عورتوں کو مساوی درجہ نہیں دے سکتا خواہ وہ مساوات کے کتنے ہی نعرے لگائے۔

عورت سماجی اور معاشرتی ڈھانچے کا اہم حصہ ہے لیکن حکمرانی صرف مرد ہی کرتا ہے۔ حکم کی پابندی کرنا عورت کا مقدر بن چکا تھا۔ عورت کی سماجی حالت بدلتے وقت کے ساتھ بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ دنیا کے مختلف ممالک مثلاً چین، یونان، مصر، بابل، انگلستان، روشیا اور عرب وغیرہ میں عورت کی پستی اور کمتری کی داستان دیکھی جاسکتی ہے۔ کسی بھی ملک میں عورت کو وہ مقام حاصل نہ تھا جو مردوں کو تھا۔ غرض کہ عورت کی سماج میں کوئی عزت نہ تھی، ان کی سماجی زندگی

''انگریزوں کے تسلط نے جہاں ایک طرف عورتوں پر ہونے والے مظالم کو بڑھاوا دیا وہیں دوسری طرف بعض انگریزوں کی روشن خیالی کے سبب ہندوستانیوں کے ذہنوں پر تعمیری اثرات مرتب ہوئے۔ مشنریوں نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے تعلیمی ادارے، مکتب و مدرسے اور یتیموں کے لیے اقامت گاہیں قایم کیے۔ مشنریوں کی کوشش سے ہی مرد اور عورت دونوں ہی عورتوں کی اصلاح کے لیے آگے آئے۔ یہی وہ دور تھا جب عورتوں کے حق کے لیے مختلف تحریکوں کا آغاز ہوتا ہے۔ راجا رام موہن رائے اور سر سید کی اصلاحی تحریکیں عروج پر تھیں۔ جس کا خاص مقصد جدید تعلیم حاصل کرنا تھا۔ راجا راموہن رائے نے سماج کی جہالت، عورتوں کی زبوں حالی، ستی رسم اور کم عمری کی شادیوں کے خلاف آوازیں بلند کیں۔راجا رام موہن رائے کے ساتھ کشیپ چندر سین اور ایشور چند ودیا ساگر کا نام بھی آتا ہے۔''

کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جہاں ان کے ساتھ ظلم و بربریت نہ کیا گیا ہو۔ یہ ایسا دور تھا کہ عورتیں اپنے دل پر پتھر رکھ کر جبر کر رہی تھیں، لب کشائی کا ان مین حوصلہ نہ تھا۔ اس سے عورتوں کی خواہشات، جذبات اور امنگیں مجروح ہوتی چلی گئیں۔ غرض مذہب کوئی بھی ہو عورت صرف عورت تھی ان کی سماجی حالت یکساں تھی۔

جہاں تک تحریک نسواں کا سوال ہے ہم جانتے ہیں کہ اس کی شروعات یورپ اور امریکہ سے ہوتی ہے ڈاکٹر شمیم نکہت کے مطابق:

> ''جوڈتھ میول، ایلن لیون اور جوفریمین وہ عورتیں ہیں جنھوں نے عورتوں کی تاریخ اور مسائل پر مضامین جمع کئے اور ایک مدلل کتاب لکھی۔ اسٹیسٹن نے اپنی تمام توجہ عورتوں کے مسائل اور مذہب اور گرجے کے باہمی تعلق پر مرکوز کر دی۔ اس نے 23 عورتوں کے ساتھ مل کر عورت کی انجیل The Womens Bible مرتب کی۔ جس میں عورتوں کے نقطۂ نگاہ کو پیش کیا گیا۔'' 1

اس طرح اجتماعی طور پر اس تحریک کی باقاعدہ شروعات انیسویں صدی میں ہوئی۔ امریکہ اور یورپ کی یہ بیداری کہیں نہ کہیں ہندوستان کے لیے بھی فائدہ مند ثابت ہوئی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں سماج کے مختلف شعبوں میں حالات کی تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں ایک نئی سوچ اور فکر کا جنم ہوتا ہے۔ تمام ہندوستان پر تقریباً انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ہندوستانی عوام خود کو اپنے ہی ملک میں اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ اس عہد کے رئیس و نواب خود تو کوٹھے پر جاتے ہی تھے ساتھ ہی اپنے شان و شوکت کے مظاہرے کے لیے اپنے بچوں کو بھی کوٹھے پر بھیجا کرتے تھے۔ ایسی صورت حال میں طوائفوں کا کوٹھا عیش پرستی اور جنسی تسکین کا مرکز بن گیا۔ گھر کی بیوی یا عورت سے تمام حقوق چھین لیے گئے۔ دھیرے دھیرے اس بری لت سے عوام بھی جڑنے لگے جو اخلاقی پستی کی سب سے بڑی وجہ ثابت ہوئی۔ اب عالم یہ تھا کہ عورت صرف بچہ پیدا کرنے کی مشین بن کر رہ گئی تھی۔ غرض کہ سب سے بری حالت سماج میں اس وقت عورتوں کی تھی۔ غلام محی الدین انصاری سالک رقم طراز ہیں:

> ''اس دور میں عورتوں کے حوالے سے سماج دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ پہلا عیش و نشاط کا اڈہ طوائفوں کا کوٹھا تھا جسے سماج میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور دوسرا حصہ بیوی سے متعلق تھا جو گھر میں رہتے ہوئے تمام سماجی اور معاشی حقوق سے محروم تھی، اس کی اہمیت ایک خادمہ سے بھی بدتر تھی۔'' 2

انگریزوں کے تسلط نے جہاں ایک طرف عورتوں پر ہونے والے مظالم کو بڑھاوا دیا وہیں دوسری طرف بعض انگریزوں کی روشن خیالی کے سبب ہندوستانیوں کے ذہنوں پر تعمیری اثرات مرتب ہوئے۔ مشنریوں نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے تعلیمی ادارے، مکتب و مدرسے اور یتیموں کے لیے اقامت گاہیں قائم کیے۔

خواب کا پورا ہونا یعنی کانفرنس کے مقصد کا پورا ہونا ناممکن تھا۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں بھی انھوں نے عورتوں کی اصلاح و فلاح کے لیے کئی مضامین لکھے۔ علی گڑھ میں 1904 میں عورتوں کی پہلی کانفرنس ہوئی جس کی قیادت شیخ عبداللہ نے کی۔ اس کانفرنس میں عورتوں کی آزادی اور تعلیم و تربیت کے منصوبے بنائے گئے۔

وویکانند نے بھی لڑکیوں کی کم عمری میں شادی کی مخالفت کی۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم پر زور دیتے ہوئے مساوات کی مانگ کی۔ انیسویں صدی کے آخر تک مسلمان عورتیں قومی و تعلیمی میدان میں زور وشور سے حصہ لے رہی تھیں۔ انھوں نے خدا اور رسول کے ذریعہ دیے ہوئے حقوق کا مطالبہ کیا۔ جس کی وجہ سے انھیں کٹر مردوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی زمانے میں ملک میں کئی رسالے نکلتے تھے۔ جس سے عورتوں میں سیاسی اور سماجی آگہی پیدا ہو رہی تھی۔

''انیسویں صدی کے آخر تک مسلمان عورتیں قومی و تعلیمی میدان میں زور و شور سے حصہ لے رہی تھیں۔ انھوں نے خدا اور رسول کے ذریعہ دئیے ہوئے حقوق کا مطالبہ کیا۔ جس کی وجہ سے انہیں کٹر مردوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی زمانے میں ملک میں کئی رسالے نکلتے تھے۔ جس سے عورتوں میں سیاسی اور سماجی آگہی پیدا ہو رہی تھی۔ اب خواتین اپنے ملک کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک کے حالات سے بھی واقف رہنے لگیں۔ ان رسالوں میں ممتاز حسین کی 'تہذیب نسواں' لاہور سے شیخ عبداللہ کی 'خاتون' علی گڑھ سے اور دلی سے 'عصمت' شیخ اکرام کی نگرانی میں نکلتا تھا۔ ان رسالوں نے عورتوں میں حصول علم کا جذبہ پیدا کیا اور انہیں روشن خیال بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ان کے علاوہ 'خواجہ بانوُ نے دهلی سے کئی رسالے نکالے۔ ان رسالوں میں اس وقت کی متعدد ناول نگار و افسانہ نگار خواتین اپنے مضامین لکھا کرتی تھیں جو خواتین کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔

اب خواتین اپنے ملک کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک کے حالات سے بھی واقف رہنے لگیں۔ ان رسالوں میں ممتاز حسین کی 'تہذیب نسواں' لاہور سے شیخ عبداللہ کی 'خاتون' علی گڑھ سے اور دلی سے 'عصمت' شیخ اکرام کی نگرانی میں نکلتا تھا۔ ان رسالوں نے عورتوں میں حصول علم کا جذبہ پیدا کیا اور انھیں روشن خیال بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ان کے علاوہ 'خواجہ بانوُ نے دہلی سے کئی رسالے نکالے۔ ان رسالوں میں اس وقت کی متعدد ناول نگار و افسانہ نگار خواتین اپنے مضامین لکھا کرتی تھیں جو خواتین کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ شبنم آرا فرماتی ہیں:

> ''اس وقت ہندوستان میں عطیہ فیضی، آبرو بیگم، آلہ بی مسز رضا علی، سعید احمد بیگم، شریفہ جامہ علی، بیگم عبداللہ، بیگم آمنہ طیب، سلطان جہاں بیگم، بیگم بھوپال وغیرہ روشن خیال اور ترقی پسند خواتین موجود تھیں، جو ہر سطح پر

مشنریوں کی کوشش سے ہی مرد اور عورت دونوں ہی عورتوں کی اصلاح کے لیے آگے آئے۔ یہی وہ دور تھا جب عورتوں کے حق کے لیے مختلف تحریکوں کا آغاز ہوتا ہے۔ راجا رام موہن رائے اور سرسید کی اصلاحی تحریکیں عروج پر تھیں۔ جس کا خاص مقصد جدید تعلیم حاصل کرنا تھا۔ راجا راموہن رائے نے سماج کی جہالت، عورتوں کی زبوں حالی، ستی رسم اور کم عمری کی شادیوں کے خلاف آوازیں بلند کیں۔ راجا رام موہن رائے کے ساتھ کشیپ چندر سین اور ایشور چند ودیا ساگر کا نام بھی آتا ہے۔ فہمیدہ کبیر لکھتی ہیں:

> ''اس عہد کو اصلاح و درستی کا دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مختلف قسم کی اصلاحی تحریکیں اس عہد میں پیدا ہوئیں۔'' 3

اسی زمانہ میں سرسید نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد ہندوستانی مسلمانوں کو ذہنی معاشرتی اور اخلاقی پستی سے ابھارنا تھا۔ سرسید یہ سمجھتے تھے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی بھی اصلاح کی جانی چاہیے کیونکہ بغیر اس کے ان کے

عورتوں کی حیثیت کو تبدیل کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔'' 4

اصلاحی تحریکوں کے سبب عورتوں کی آزادی اور مساوات کی فضا سازگار ہوئی۔ دنیا کی تمام تحریکات کی طرح تانیثیت کی تحریک بھی مغرب کے زیراثر ہندوستان میں فروغ پاسکی۔ اس تحریک کے باعث عورتوں میں بیداری پیدا ہوئی۔ عورتیں یہ محسوس کرنے لگیں کہ وہ صرف بیوی یا ماں کے فرائض ہی پورے نہیں کرسکتیں بلکہ اپنی ذہانت کے ذریعہ سماج کے مختلف شعبوں میں وہ مرد کے کندھے سے کندھا ملا کر چل سکتی ہیں۔ چنانچہ ملک کی متعدد عورتیں جو اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی تھیں انھوں نے مغربی ملکوں کا سفر کیا اور وہاں تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد ان عورتوں نے سماج کی تشکیل کا کام انجام دیا۔ اینی بیسنٹ، سروجنی نائڈو، کملا دیوی چٹوپادھیائے، سرلا دیوی، کستور با گاندھی اور بی امان وغیرہ نے اپنی ذہانت کے زور پر ملک میں خوش گوار تبدیلیاں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عورتوں کی پس ماندگی دور کرنے کی پوری کوشش کی۔ اینی بیسنٹ خود عورتوں کی اصلاح کا کام انجام دے رہی تھیں ساتھ ہندوستان کے تمام باشندوں سے بھی یہی امید کرتی تھیں کہ ''اگر وہ اپنی اور اپنے ملک کی ترقی چاہتے ہیں تو انھیں عورتوں کی اصلاح کرنی چاہیے۔'' اینی بیسنٹ تحریک نسواں اور تحریک آزادی دونوں ہی میدانوں میں پیش پیش تھیں۔ مارگریٹ کرسن کے ذریعے عورتوں کی اصلاح کے لیے ایک انجمن قائم کیا گیا۔ مارگریٹ کرسن تحریک نسواں کی حمایتی تھیں ان تحریکات کا ہندوستان اور ہندوستانیوں پر بہت گہرا اثر پڑا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کے مطابق:

''ان تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ عورتیں تعلیم خصوصاً انگریزی تعلیم کی طرف بڑھنے لگیں اور علم و ہنر کے راستے ان کے لیے کھلنے لگے 1883 میں پہلی بار ہندوستانی عورت گریجویٹ ہوئی اور 1892 میں پہلی بار ہندوستانی عورت ڈاکٹری پڑھنے کی غرض سے آکسفورڈ گئی۔'' 5

تحریک آزادی ملک کی انگریزوں کی غلامی سے آزادی کی تحریک تھی لیکن اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ عورتوں کو پہنچا۔ اب عورت پہلے سے زیادہ روشن خیال ہوگئی اور اس کے ارادوں میں پختگی آگئی تھی۔ جب ہندوستان میں یہ سرگرمیاں چل رہی تھیں اسی وقت دنیا کے مختلف ملکوں میں عورتیں 'ووٹ' کے حق کے لیے مطالبہ کر رہی تھیں۔ حکومت کے بار ہا انکار کے بعد آخر عورتیں اپنی کوشش میں کامیاب ہوئیں۔ ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں:

''دنیا میں عورتوں کو ووٹ دینے کا سب سے پہلا حق نیوزی لینڈ میں 1892 میں دیا گیا اس کے بعد 1902 میں آسٹریلیا 1917 میں انگلینڈ 1918، کنیڈا 1924 میں منگولیا کی عورتوں کو حق رائے دہندگی ملا۔'' 6

فرانس میں عورتوں کو یہ حق 1944 اور سویٹزرلینڈ میں 1971 میں حاصل ہوا۔ لیکن ہندوستان میں ان ممالک سے بہت پہلے یعنی 1926 میں ہی عورتوں کو ووٹ ڈالنے کا شرف حاصل ہوگیا تھا۔ اب قوم بیداری کی راہ پر گامزن ہو چکی تھی۔ 1932 میں ڈاکٹر رشید جہاں نے 'انگارے' جیسی تہلکہ خیز کتاب میں شامل ہوکر عورتوں کو دعوت فکر دیا اور انھیں سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیا۔ آگے چل کر عصمت چغتائی نے ان کے راہ کو اپناتے ہوئے سماجی حقیقتوں کو اپنی تحریک کا موضوع بنایا اور لوگوں کو دعوت غور وفکر کا موقع دیا۔ قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین، ممتاز شریں، رضیہ سجاد ظہیر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، زاہدہ حنا، فرخندہ لودھی، جیلانی بانو وغیرہ اردو ادب کے خاص نام ہیں جن کی تحریروں میں ہمیں تانیثیت کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔ اردو شاعراؤں میں ادا جعفری، زاہدہ زیدی، زہرہ نگاہ، کشور ناہید، پروین فنا سید، داراب بانو وفا، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض وغیرہ ایسے نام ہیں جنھوں نے تحریک نسواں کی حمایت کی اور اپنی تحریروں میں اپنی فکر کو پرویا اور اس تحریک کو جلا بخشی۔ علی احمد فاطمی بھی رشید جہاں اور تحریک نسواں کے بارے میں فرماتے ہیں:

''آج جو نسائیت یا تانیثیت کی تحریک سر اٹھا رہی ہے اس میں بھی رشید جہاں کا خون پسینہ کام کر رہا ہے۔'' 7

صرف اردو ادب ہی نہیں بلکہ ملک کی دوسری زبانوں نے بھی عورتوں کے مسائل اور تحریک نسواں جیسے موضوعات پر مضامین اور شاعری کو ادب میں شامل کیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی شاعری

میں عورتوں کے موضوعات کو شامل کیا۔ گاندھی جی سب سے بڑے سیاسی رکن تھے وہ بھی تحریک نسواں کے حامی تھے۔ وہ عورتوں کی عزت کرتے تھے اور دوسروں سے بھی یہی امید کرتے تھے۔ عورت کو 'ابلا' یا 'بیچاری' کہنا گاندھی جی کو ناپسند تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ عورت کو اس طرح کہنا انھیں بدنام کرنا ہے۔ ڈاکٹر ایم .اے. انصاری لکھتے ہیں:

> "گاندھی جی کہتے تھے استری کو ابلا کہنا اسے بدنام کرنا ہے۔ ایسا کہنے کا ارتھا گر یہ ہو کہ استری میں پوروش جیسی پاشوک ورتّی نہیں ہے، یا اتنی ماترا میں نہیں ہے جتنا کہ پوروش میں ہوتی ہے، تو یہ آروپ مانا جاسکتا ہے، پر یہ چیز تو استری کو پوروش کی اپیکچھا پنیت بنانے والی ہے، اور استری پوروش کی اپیکچھا پنیت ہے ہی، وہ اگر آگھات کرنے میں نربل ہے تو کشٹ سہن کرنے میں بھی بلوان ہے۔8

1932 میں Lady india home science conference کے نام کا ایک ادارہ قیام میں آیا۔ اس ادارے کا مقصد عورتوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی سے دلچسپی پیدا کرنا تھا۔ 1935 کے قانون کے مطابق ہندوستان کو مزید حقوق فراہم کیے گئے۔ اس طرح روز بہ روز ترقی کرتے ہوئے عورتیں آج زندگی کے ہر میدان میں اپنی کامیابی کا پرچم لہرا رہی ہیں۔

سماج کے تمام شعبوں میں عورتیں آج اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ پھر چاہے وہ جو بھی پیشہ ہو، قانون، میڈیکل، انجینیرنگ، ٹیچر، پروفیسر، پولس، سیاست، پائلٹ یہاں تک ڈرائیور اور کنڈکٹر جیسے پیشے میں وہ سرگرم ہیں۔ کوئی بھی میدان ان کے لیے اچھوتا نہیں رہ گیا ہے۔ دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور عورتوں میں ہندوستانی عورتوں کے بھی نام ہیں۔ ہندوستان میں نصف سے زیادہ کام کاجی عورتوں میں تقریباً 54 فیصدی عورتیں بینکنگ اور فنانیشل شعبے میں سرگرم ہیں۔ میڈیا اور لائف سائنسیز میں 11 فیصد اور ایف. ایم. سی. جی. میں 8 فیصد عورتوں کی حصہ داری ہے۔ پورے ملک میں تقریباً 163000 عورتیں پنچایت کے مختلف عہدوں پر فائز ہیں جبکہ سرپنچ کے طور پر قریب 10000 عورتیں کام کر رہی ہیں۔ سیاست میں عورتوں کی حصے داری روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔ پارلیامنٹ کے کل سیٹوں میں 11 فیصد اور منسٹر کے عہدوں میں 10 فیصد عورتوں کا قبضہ ہے۔ سیاست کے ساتھ ساتھ آج عورتیں کھیل اور فلم کے میدان میں بھی نام کما رہی ہیں۔ قومی سطح پر خواتین پولس کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ تانیثی تحریک کا اگر قومی تناظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس تحریک سے عورتوں کو ایک عمدہ پلیٹ فارم ملا جس کے ذریعہ آج وہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں۔ اس طرح نسائی فکر کے علم برداروں اور نسائی تنظیموں کے ساتھ سماجی رکن کی بے پناہ کوششوں اور محنت کی وجہ سے آج عورتیں تمام شعبوں میں بغیر کسی اختلاف کے نہ صرف نظر آ رہی ہیں بلکہ ترقی کر رہی ہیں۔ حالانکہ ابھی بھی ملک کے کچھ حصوں میں تعلیم کی کمی کے باعث عورتیں پستی کی شکار ہیں۔ پھر بھی عورتوں کی کامیابی کی یہ کرنیں ہی ایک دن روشن صبح لے آئیں گی۔

حوالے

1 تحریک آزادی نسواں، از شمیم نکہت، ص158
2 ہندو پاک کی خواتین ناول نگار، از ڈاکٹر محی الدین انصاری سالک، ص28
3 اردو ناول میں عورت کا تصور، از فہمیدہ کبیر، ص9
4 تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول، از شبنم آرا، ص92
5 نئی تنقید نئے اقدار، تحریک نسواں اور اردو ادب، از پروفیسر علی احمد فاطمی، ص43
6 آزادی نسواں کی جدوجہد، از شمیم نکہت، ص43
7 رشید جہاں اور ترقی پسند تحریک۔ ڈاکٹر رشید جہاں، از پروفیسر علی احمد فاطمی، ص57
8 راشٹریہ مہیلا آیوگ اور بھارتی ناری۔ ایم۔ اے۔ انصاری، ص227

□□□

Dr.Nilofer Firdaus
Assistant Professor
Dept.Of Urdu
Aliah University,17, Gorachand Road
Kolkata-700014 (West Bengal)
E-mail.nilofer@aliah.ac.in

جوہی بیگم شاما

اس کو انسان کے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے
سہما سہما سا کیوں ہر ایک شجر لگتا ہے

موت بھی آ کے مرے در سے پلٹ جاتی ہے
یہ مری ماں کی دعاؤں کا اثر لگتا ہے

کتنا شاطر ہے زمانے سے دغا کرتا ہے
اپنا یہ عیب بھی ظالم کو ہنر لگتا ہے

میں نے امرت کی طرح نوش کیا ہے اس کو
مجھ کو زہراب حلاوت میں شکر لگتا ہے

حسنِ اخلاق کی دولت سے ہے محروم اگر
ایسا کردار تو بے آب گہر لگتا ہے

یہ مرا صبر و تحمل تو مری ہے طاقت
مجھ کو طوفان سے کب خوف و خطر لگتا ہے

اب وہ نالے نہیں آہیں نہیں فریاد نہیں
دل تو جیسے کوئی ویران نگر لگتا ہے

ہم کو تنہائی سے کچھ ایسی ہے نسبت شاما
کہ ستاروں میں بھی تنہا سا قمر لگتا ہے

Dr. Joohi Begum
59C/67C, South Malaka
Prayagraj-211003 (U.P)
dr.joohibegum@gmail.com

فرزانہ پروین

روٹھ کر بیٹھے ہیں خود ہی مجھ کو سمجھائیں گے کیا
میں بھی ایسا ہی کروں تو پھر وہ رہ پائیں گے کیا

کب تلک تکتے رہیں گے آپ میرے چہرے کو
کہہ چکی میں حالِ دل، کچھ آپ فرمائیں گے کیا

میں اگر پتھر ہوں پتھر ہی مجھے تم رہنے دو
شیشہ بن جاؤں گی تو پتھر نہیں آئیں گے کیا

آپ عالم، آپ عاقل، آپ دانش مند ہیں
آپ اشکوں سے لکھی تحریر پڑھ پائیں گے کیا

جھوٹ پر اپنی انھیں جب شرم آتی ہی نہیں
بے وفائی پر کبھی وہ اپنی پچھتائیں گے کیا

اے مرے دل، پیارے دل، معصوم دل، یہ تو بتا
جب پکاروں گی انھیں سچ مچ وہ آ جائیں گے کیا

کوششیں کرنی ہیں جتنی آپ بیشک کیجیے
آپ فرزانہ کو لیکن بھول بھی پائیں گے کیا

Farzana Parveen
The Quraish Institute
5/1, Kimber Street
Kolkata - 700017(West Bengal)
Email-fparveen150@gmail.com

واردات

سحر اسعد

نئے شہر میں بطور تھانیدار میرا تبادلہ ہوا تو میں نے جلد ہی اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور صبح سویرے تھانے جا پہونچا۔ تھانے کی عمارت انگریزوں کے دور کی سرخ پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں پہونچ کر ضروری فائلیں دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ایک سپاہی کی آمد ہوئی۔ اس سے میں علاقے کی اہم باتیں پوچھنے لگا۔ ادھر ادھر کی باتیں بتانے کے بعد اس نے مجھے ایک حیرت انگیز واردات کے بارے میں بتایا۔ بقول اس کے شہر میں ایک چوٹی کٹوا گھس آیا ہے جو لڑکیوں کی چوٹی کاٹ لیتا ہے، جس سے لوگوں میں بالخصوص خواتین میں خوف وہراس پھیلا ہوا ہے۔ اب تک کل تین لڑکیوں کی چوٹی کٹی ہوئی پائی گئی ہے۔

علاقے میں امن وامان رکھنا میری ذمہ داری تھی، لہٰذا میرے لیے یہ جاننا ضروری ہوگیا کہ لڑکیوں میں دہشت پھیلانے والا کون ہے اور اس سے اس کا کیا مقصد ہے؟

میں ان تینوں لڑکیوں کے گھر گیا اور باقاعدہ ہر متاثرہ سے اس پر تفصیلی گفتگو کی۔ پہلی لڑکی کا نام انعم صبا تھا، وہ ایک فیشن ایبل اور بولڈ لڑکی تھی، کسی حد تک وہ ڈری ہوئی تھی مگر میرے سوالوں کا اس نے خاصے اعتماد سے جواب دیا۔

اس نے بتایا کہ وہ کالج سے آنے کے بعد اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے کسی نے چھوا ہو جس سے اس کی نیند کھل گئی۔ اس نے ایک سایے کو تیزی سے کمرے سے نکلتے دیکھا پھر اس کی نظر اپنے بستر پر پڑی جس پر اس کی چوٹی کٹی ہوئی پڑی تھی، بے اختیار اس نے اپنے بالوں کو چھوا تو اس کی چیخ نکل گئی، اس کی آواز سن کر اس کے ماں باپ دوڑے ہوئے آئے...

دوسری لڑکی فرحت خانم تھی، انعم کے برعکس وہ ایک حجابی لڑکی تھی، اس نے برقعے کے اندر سے ہی میرے سوالوں کا جواب دیا، اس کا بیان بھی انعم سے ملتا جلتا تھا۔

تیسری لڑکی ثنا خان تھی، اس کا تعلق صوبہ پنجاب سے تھا، کچھ عرصے پہلے وہ اپنے والدین کے ساتھ یہاں آکر بس گئی تھی، وہ مذکورہ دونوں لڑکیوں سے کہیں زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پہ ابھی تک خوف وہراس کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ اس کا بیان بھی مذکورہ دونوں لڑکیوں جیسا ہی تھا۔

تینوں لڑکیوں سے بات کرنے کے بعد میں واپس تھانے آکر

اس معاملے پر غور کرنے لگا۔ یہ بات تو طے تھی کہ تینوں وارداتوں میں ایک ہی شخص کا ہاتھ تھا۔ علاقے کے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کوئی ہوائی مخلوق ہے۔ بظاہر تینوں لڑکیوں میں کوئی مشترک بات دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہی بات مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے لڑکیوں کے ساتھ اس طرح کی واردات میں عموماً کسی ایسے شخص کا ہاتھ ہوتا تھا جو لڑکیوں کو بے راہ روی سے بچنے کی دھمکی دیتے ہوئے ایسا کرتا تھا جس سے لڑکیاں سدھر جائیں۔ مگر اس معاملے میں ایسا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اگلے دن جب میں اپنے تھانے میں بیٹھا دو پارٹیوں کے درمیان صلح کرا رہا تھا تبھی سپاہی اندر داخل ہوا، مجھے مصروف دیکھ کر وہ باہر بیٹھ گیا۔ کمرہ خالی ہو جانے کے بعد وہ اندر آیا تو اس نے مجھے ایک اہم بات بتلائی۔

''صاحب! ان تینوں لڑکیوں کے درمیان تعلق پتہ چل گیا ہے۔ تینوں ایک ہی کالج میں پڑھتی ہیں۔''

''میری آنکھیں یہ سن کر چمکنے لگیں۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ابھی کالج کا وقت نکلا نہیں تھا۔ میں اسی وقت سیدھے کالج کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ کالج شہر کے بالکل آخری کونے پر واقع تھا اس لیے مجھے وہاں پہونچتے پہونچتے قریباً پون گھنٹے لگ گئے۔
وہاں جاکر میں نے پرنسپل سے بات کی اور ان کو اس واقعے سے آگاہ کیا۔ حیرت انگیز طور پر انہیں اس بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ ورنہ لڑکیوں کی ایسی باتیں تو بہت جلدی پھیل جاتی ہیں۔ بظاہر ان سے کچھ دیر گفتگو کے بعد میں وہاں سے اٹھ گیا۔ ان سے ایک اہم بات مجھے معلوم ہوئی جس نے یہ سارا مسئلہ حل کر دیا۔''

میری آنکھیں یہ سن کر چمکنے لگیں۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ابھی کالج کا وقت نکلا نہیں تھا۔ میں اسی وقت سیدھے کالج کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ کالج شہر کے بالکل آخری کونے پر واقع تھا اس لیے مجھے وہاں پہونچتے پہونچتے قریباً پون گھنٹے لگ گئے۔

وہاں جا کر میں نے پرنسپل سے بات کی اور ان کو اس واقعے سے آگاہ کیا۔ حیرت انگیز طور پر انھیں اس بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ ورنہ لڑکیوں کی ایسی باتیں تو بہت جلدی پھیل جاتی ہیں۔ بظاہر ان سے کچھ دیر گفتگو کے بعد میں وہاں سے اٹھ گیا۔ ان سے ایک اہم بات مجھے معلوم ہوئی جس نے یہ سارا مسئلہ حل کر دیا۔

تھانے واپس آ کر میں نے تینوں لڑکیوں کو مع ان کے سرپرست کے تھانے بلوایا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ لوگ تھانے میں موجود تھے۔ تینوں لڑکیاں ایک ساتھ بلائے جانے کی وجہ سے مجھے کچھ پریشان سی دکھائی دیں۔ میں نے ثنا خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''جی ثنا بی بی! آپ کس کالج میں پڑھتی ہیں؟''

اس نے اپنے کالج کا نام یوں بتایا جیسے اعتراف جرم کر رہی ہو۔

اسی طرح باقی لڑکیوں سے بھی باری باری میں نے یہ سوال پوچھا۔ جواب دیتے وقت ان کا انداز بتلاتا تھا کہ وہ جان گئی ہیں کہ میں سچ سے واقف ہو چکا ہوں۔

میں نے اپنی میز کے اندر ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ایک پوٹلی نکالی۔ پوٹلی کا منہ بندھا ہوا تھا میں نے پوٹلی کے اندر سے بالوں کے تین گچھے نکالے اور ان کے سامنے رکھ دیے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔

''انسپکٹر صاحب! یہ.. یہ.. آپ کہاں سے.. آپ..'' انعم صبا کے منہ سے بے ترتیب جملے نکلے۔ فرحت خانم کی حجاب سے جھانکتی آنکھیں بھی خوفزدہ تھیں۔

''اب پورے معاملے پر روشنی ڈالنا پسند کریں گی آپ؟'' میں نے ان تینوں کو طنزیہ مخاطب کیا۔

''انسپکٹر صاحب! ہمیں معاف کر دیجیے۔ ہم سے غلطی

ہوگئی۔" ثنا گھگھیائی۔

"اگلی صبح میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ان لڑکیوں نے تو یہ پوچھا ہی نہیں کہ مجھے یہ ساری بات کیسے معلوم ہوئی اور بالوں کے گچھے مجھے کیسے ملے۔ میرا ذہن کل کالج کی پرنسپل سے گفتگو کی طرف چلا گیا جنھوں نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا کہ کالج میں امتحان ہو رہے ہیں۔ یہیں سے میرے ذہن میں کچھ کلک ہوا۔ واپس آکر قصبے میں کھلے اکلوتے بیوٹی پارلر میں چلا گیا اور وہاں جاکر پوچھ تاچھ کی۔ بیوٹیشین نے اپنی سادگی میں مجھے بتلادیا کہ کچھ دن پہلے تین لڑکیاں آئی تھیں اور یہ بال بیچ کر چلی گئیں۔ بس پھر کیا تھا میرا کام آسان ہوگیا۔ اگرچہ بیوٹیشین نے ان کے نام نہیں بتلائے تھے لیکن مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ وہی تین لڑکیاں ہوں گی پھر میں نے جب ان کے سامنے بال نکالے تو انھوں نے ڈر کر خود ہی ساری بات اگل دی "

"شہر میں کچھ لڑکوں سے ہماری دوستی ہوگئی تھی۔ ہم کالج کے بہانے ان سے ملنے جاتے تھے۔ ہمارے امتحان شروع ہونے والے تھے، اور ہم نے خاک پڑھائی بھی نہ کی تھی۔ فرحت کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ اگر اس نے امتحان پاس نہ کیا تو وہ اسے کالج سے اٹھالیں گے۔ کالج کی وجہ سے ہی بے چاری کو کچھ تفریح کا موقع مل جاتا تھا۔ اس لیے اپنی دوست کی خاطر ہم نے یہ ڈرامہ رچایا تھا۔ ہم نے کئی سال پہلے اس طرح کی باتیں سنیں تھیں اور اخبارات میں پڑھا بھی تھا۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ ہمارے اس ڈرامے میں قصبے کے سادہ لوگ فوراً آجائیں گے کیوں کہ یہ ہوائی چیزوں سے ڈرتے ہیں۔ اور یہی ہوا۔ عین امتحانات کے موسم میں ہم نے یہ ڈھونگ رچایا اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بال کاٹے اور گھر والوں کو اپنی گھڑی ہوئی کہانی سنادی۔" انعم نے سر جھکا کر پوری بات سنادی۔

"بچیو! میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی بہت بڑا جرم نہیں تھا اور نہ ایسے معاملات میں پولیس دخیل ہوتی ہے۔ میں نے تو صرف اس لیے اس معاملے میں ہاتھ ڈالا تھا کہ کہیں کل کو یہ کوئی بڑی واردات کا پیش خیمہ نہ ہو۔ بہرحال یہ بڑا جرم نہ ہوکر بھی بڑا جرم ہے۔ اپنے والدین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا جرم۔ لوگوں کو بے وقوف بنانے اور ان کے جذبات کا مذاق اڑانے کا جرم۔ سماج میں ڈر پھیلانے کا جرم" میں نے ایک لمبی تقریر کرڈالی۔

"انکل ہمیں معاف کردیں، ہم اگلے سال آپ کو ضرور پاس ہوکر دکھائیں گے۔" ثنا فرحت کے والد سے بولی۔

انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سب شرمندہ سی اپنے والدین کے ہمراہ اپنے اپنے گھر لوٹ گئیں۔

اگلی صبح میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ان لڑکیوں نے تو یہ پوچھا ہی نہیں کہ مجھے یہ ساری بات کیسے معلوم ہوئی اور بالوں کے گچھے مجھے کیسے ملے۔ میرا ذہن کل کالج کی پرنسپل سے گفتگو کی طرف چلا گیا جنھوں نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا کہ کالج میں امتحان ہو رہے ہیں۔ یہیں سے میرے ذہن میں کچھ کلک ہوا۔ واپس آکر قصبے میں کھلے اکلوتے بیوٹی پارلر میں چلا گیا اور وہاں جاکر پوچھ تاچھ کی۔ بیوٹیشین نے اپنی سادگی میں مجھے بتلادیا کہ کچھ دن پہلے تین لڑکیاں آئی تھیں اور یہ بال بیچ کر چلی گئیں۔ بس پھر کیا تھا میرا کام آسان ہوگیا۔ اگرچہ بیوٹیشین نے ان کے نام نہیں بتلائے تھے لیکن مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ وہی تین لڑکیاں ہوں گی پھر میں نے جب ان کے سامنے بال نکالے تو انھوں نے ڈر کر خود ہی ساری بات اگل دی۔

میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے پردے ہٹائے اور باہر جھانک کر دیکھا۔ کل تک لوگوں کے چہروں پہ جو دبا دبا سا خوف تھا وہ آج بے فکری اور اطمینان میں بدل گیا تھا۔

□□□

Sahar Asad
B18/1 G, Reori Talab
Varanasi-221010 (U.P)
E-mail: saharasad739@gmail.com

صحت

سعدیہ زاہد

خواتین کی صحت مند زندگی کے لیے غذا کی اہمیت

صحت کے تصورات:

صحت ایک وسیع اور ہمہ گیر تصور ہے، جو محض بیماریوں کی غیر موجودگی تک محدود نہیں۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) کے مطابق، صحت کی تعریف جسمانی، ذہنی، اور سماجی خوشحالی کی مکمل حالت سے کی جاتی ہے۔ خواتین کی صحت کا مفہوم اس لحاظ سے مزید اہمیت اختیار کر لیتا ہے کہ یہ نہ صرف ان کی ذاتی زندگی بلکہ ان کے خاندان، معاشرتی حلقوں اور مجموعی طور پر سماج پر گہرے اثرات ڈالتی ہے۔ اس تناظر میں، تغذیہ خواتین کی صحت کا ایک بنیادی عنصر ہے، جو جسم کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کی صلاحیت فراہم کرتا ہے۔ خواتین کی صحت اور تغذیہ کے مابین تعلق کو سمجھنا ان کی جسمانی، ذہنی، اور سماجی بہبود کے لیے ناگزیر ہے۔

صحت کا تصور ایک متحرک اور ارتقائی عمل ہے، جو سماجی عوامل اور انفرادی ضروریات سے متاثر ہوتا ہے۔ خواتین کو چاہیے کہ وہ صحت کا ایک جامع نقطۂ نظر اپنائیں جو ان کے حیاتیاتی، نفسیاتی، اور سماجی پہلوؤں کو مدنظر رکھے۔ متوازن غذا صحت مند زندگی کے اس توازن کو قائم رکھنے میں ایک کلیدی کردار ادا کرتی ہے اور بیماریوں کی روک تھام کے ساتھ ان کے مؤثر علاج کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

یونانی طب میں صحت کا تصور:

یونانی طب میں صحت کا مفہوم ایک جامع نقطہ نظر کا حامل ہے، جس میں جسمانی، ذہنی، جذباتی، اور روحانی خوشحالی شامل ہیں۔ اس نظام میں صحت کو جسم کے چار اخلاط (خون، بلغم، صفرا، سودا) کے توازن کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ اخلاط چار بنیادی عناصر (مٹی، پانی، ہوا، آگ) سے وابستہ ہیں، اور ان کا توازن جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔

یونانی طب کے مطابق، صحت مند جسم وہ ہے جس میں تمام اعضا اپنی مکمل صلاحیت کے ساتھ کام کریں، اور یہ حالت جسم کے اندرونی توازن پر منحصر ہے۔ یہ توازن متعدد عوامل، جیسے طرزِ زندگی، ماحول، اور خوراک، کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس کے مطابق، صحت کی حفاظت صرف اخلاط کے نظم و ضبط تک محدود نہیں بلکہ تغذیہ، جسمانی سرگرمی، اور ذہنی سکون کے محتاط انتظام پر مبنی ہے۔ مزاج بھی یونانی طب میں صحت کے اہم پہلوؤں میں سے ایک ہے، جو فرد کی جسمانی اور ذہنی ساخت کی وضاحت کرتا ہے۔ ہر شخص کے مزاج کے مطابق غذائی اور طرزِ زندگی کے مشورے دیے جاتے ہیں تا کہ توازن قائم رکھا جا سکے اور بیماریوں سے بچا جا سکے۔

صحت

صحت مند زندگی کی اہمیت:

صحت مند زندگی نہ صرف خواتین کو اپنی ذاتی اور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانے کے قابل بناتی ہے بلکہ انھیں ایک بھرپور اور باوقار زندگی گزارنے کا موقع بھی فراہم کرتی ہے۔ یہ انھیں بیماریوں اور جسمانی کمزوریوں سے آزاد رہتے ہوئے اپنی توانائی اور صلاحیت کو بروئے کار لانے کا موقع دیتی ہے۔ متوازن غذا، جو جسم کو تمام ضروری غذائی اجزا فراہم کرتی ہے، خواتین کو روزمرہ کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے توانائی، ذہنی وضاحت، اور جسمانی طاقت مہیا کرتی ہے۔ مزید برآں، صحت مند خواتین نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ اپنے خاندان اور معاشرے میں بھی مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کی صحت اور توانائی بچوں کی بہتر تربیت، خاندانی فلاح و بہبود، اور برادریوں کی ترقی میں جھلکتی ہے۔ ایک صحت مند عورت اپنی جسمانی اور ذہنی استعداد کے ذریعے نوجوان نسل کی رہنمائی اور بنیادی نگہداشت کی فراہمی میں اہم کردار ادا کرتی ہے، جس سے نہ صرف خاندانی تعلقات مضبوط ہوتے ہیں بلکہ معاشرتی ترقی کے امکانات بھی روشن ہو جاتے ہیں۔

یونانی طب بھی صحت مند زندگی کے لیے جسمانی اور ذہنی توازن کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ اس میں طرزِ زندگی کے مختلف عوامل جیسے غذا، نیند، جسمانی سرگرمیاں، اور ذہنی سکون کو بیماریوں سے بچاؤ اور عمومی صحت کی بحالی میں کلیدی حیثیت دی جاتی ہے۔ خواتین کے لیے خاص طور پر غذائیت سے بھرپور خوراک جسمانی اعضا کی فعالیت کو مضبوط بنانے اور متوازن زندگی گزارنے کے لیے لازمی ہے۔ یونانی طب کے اصولوں کے مطابق، متوازن غذا اور منظم طرزِ زندگی ماہواری کی بے قاعدگی، ذہنی دباؤ، اور دیگر جسمانی و ذہنی بیماریوں سے بچاؤ میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

معاشرے میں صحت مند خواتین کا کردار:

صحت مند خواتین کسی بھی معاشرے کی خوشحالی کی بنیاد ہیں۔ وہ نہ صرف نگہداشت کرنے والی اور معلم ہوتی ہیں بلکہ اقتصادی ترقی میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ خواتین کی جسمانی اور ذہنی صحت انھیں اپنے خاندانوں کی بہتر دیکھ بھال کرنے، برادریوں میں مثبت تبدیلیاں لانے، اور پیشہ ورانہ محاذ پر عمدہ کارکردگی دکھانے کے قابل بناتی ہے۔ ان کی صحت کا براہ راست اثر آئندہ نسلوں کی مجموعی فلاح و بہبود پر پڑتا ہے، اس لیے ان کی غذائی ضروریات کو ترجیح دینا لازمی ہے۔ تاہم، خواتین کو اکثر یہ چیلنج درپیش ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کی غذائی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے اپنی صحت کو نظرانداز کر دیتی ہیں۔ یہ عدم توازن طویل مدتی صحت کے مسائل کا باعث بنتا ہے۔ مثال کے طور پر، بہت سی خواتین اپنی خوراک کی قربانی دیتی ہیں تاکہ بچوں کی غذائی ضروریات پوری کی جا سکیں، جس کے نتیجے میں غذائی کمی اور دیگر صحت کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان عدم مساوات کو دور کرنا اور یہ یقینی بنانا کہ خواتین کو مناسب تغذیہ میسر ہو، نہ صرف ان کی اپنی صحت بلکہ ان کے خاندان اور برادری کی مجموعی صحت کے لیے بھی ضروری ہے۔

غیر صحت مند تغذیہ کی وجہ سے عام بیماریاں:

ناقص تغذیہ مختلف صحت کے مسائل پیدا کر سکتی ہے، جو خواتین کو خاص طور پر متاثر کرتی ہیں۔ انیمیا، آسٹیوپوروسس، موٹاپا، اور دائمی امراض جیسے ذیابیطس اور دل کے امراض اکثر خراب غذائی عادات کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔

انیمیا:

خواتین میں انیمیا کی شرح زیادہ ہوتی ہے، خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں، جہاں آئرن کی کمی ایک سنگین مسئلہ ہے۔ یہ کیفیت توانائی کی کمی، تھکن، اور کمزور مدافعتی نظام کا سبب بنتی ہے۔

آسٹیوپوروسس:

کیلشیم اور وٹامن ڈی کی کمی کے نتیجے میں ہڈیوں کی کمزوری پیدا ہوتی ہے، جو آسٹیوپوروسس کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بیماری خواتین، خاص طور پر مینو پاس کے بعد کی عمر میں، فریکچر کے بڑھتے خطرے کا سبب بنتی ہے۔

طرزِ زندگی سے جڑی بیماریاں:

موٹاپا، ذیابیطس، اور دل کے امراض جیسی بیماریاں بھی غیر صحت مند تغذیہ کا نتیجہ ہیں۔ یہ حالات غذائی عادات کی اصلاح اور صحت مند زندگی کے فروغ کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

یونانی طب کے مطابق، غذائیت میں عدم توازن اخلاط کے بگاڑ کا سبب بن سکتا ہے، جو مختلف بیماریوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، بلغم کی زیادتی موٹاپے یا سانس کے مسائل پیدا کر سکتی ہے، جبکہ خون کے عدم توازن سے انیمیا یا ہارمونی عدم توازن جنم لے سکتا ہے۔

صحت مند تغذیہ کی اقسام:

صحت مند زندگی کے لیے متوازن غذا بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ غذا پروٹین، کاربوہائیڈریٹس، چکنائی، وٹامنز، اور منرلز جیسے بنیادی اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے، جو جسم کے افعال کو بہتر بناتے ہیں۔

متوازن غذا:

صحت مند غذا میں تازہ پھل، سبزیاں، مکمل اناج، کم چکنائی والے پروٹین، اور صحت مند چکنائیاں شامل ہیں۔ یہ جسم کو تمام ضروری غذائی اجزا فراہم کرتی ہے اور بیماریوں سے بچاؤ میں مددگار ہوتی ہے۔

اینٹی آکسیڈنٹ سے بھرپور خوراک:

اینٹی آکسیڈنٹ سے بھرپور غذائیں، جیسے بیریز، پتوں والی سبزیاں، اور گری دار میوے، جسم میں آکسیڈیٹو اسٹریس کو کم کرنے اور سوزش کو کم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

یونانی طب کے اصول:

یونانی طب کے مطابق، غذا کا انتخاب فرد کے مزاج (Mizaj) اور موسمی حالات کے مطابق ہونا چاہیے۔ مثلاً، صفرا کی زیادتی رکھنے والی خواتین کے لیے ٹھنڈی غذائیں فائدہ مند ہیں، جبکہ سودا کی زیادتی والے افراد کے لیے گرم غذائیں تجویز کی جاتی ہیں۔

روایتی صحت مند تغذیہ:

روایتی غذا کے اصول صحت مند اور متوازن زندگی کے لیے اہم ہیں۔ بھارت میں ملیٹ، دالیں، گھی، اور خمیر شدہ اشیاء خواتین کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے روایتی طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ غذائیں ضروری مائیکرو نیوٹرینٹس فراہم کرتی ہیں، قوتِ مدافعت کو بڑھاتی ہیں، اور جسمانی صحت کو بہتر بناتی ہیں۔

دواؤں والے جڑی بوٹیاں اور مصالحے:

روایتی غذا میں دواؤں والے جڑی بوٹیاں، جیسے ہلدی، ادرک، اور میتھی شامل ہوتی ہیں، جو اپنی طبی خصوصیات کی وجہ سے معروف ہیں۔ یہ غذائیں جدید دور کے تغذیہ کے اصولوں سے ہم آہنگ ہیں اور صحت مند زندگی کے لیے پائیدار حل فراہم کرتی ہیں۔

ثقافتی ورثے کا تحفظ

روایتی غذائی عادات کو اپنانا نہ صرف صحت کے لیے فائدہ مند ہے بلکہ یہ ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ان کے فوائد کے بارے میں عوام کو آگاہ کرنا صحت مند عادات کے فروغ میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

یونانی طب میں غذا کا اہم کردار

یونانی طب جڑی بوٹیوں اور قدرتی اجزاء کی اہمیت کو صحت مند طرز زندگی کا لازمی حصہ قرار دیتی ہے۔ زعتر (oregano)، زیرہ، نیم، اور میتھی جیسی جڑی بوٹیاں یونانی غذا کا حصہ ہیں اور ان کے علاجی فوائد مشہور ہیں۔

زعتر اور زیرہ: ہاضمے کو بہتر بناتے اور جسم کے میٹابولزم کو مضبوط کرتے ہیں۔

نیم اور میتھی: اندرونی صفائی اور مدافعتی نظام کی مضبوطی کے لیے مشہور ہیں۔ یہ اجزا صحت کے لیے ایک جامع اور متوازن طریقہ

فراہم کرتے ہیں، جوجسمانی اورذہنی فلاح وبہبود کوبڑھاتے ہیں۔

صحت مند تغذیہ کے چیلنجز اور محدودیت

اقتصادی مسائل:

اکثر خواتین اقتصادی مجبوریوں کے سبب اپنی غذائی ضروریات کوپسِ پشت ڈال دیتی ہیں۔گلوبل نیوٹریشن رپورٹ کے مطابق، تولیدی عمر کی 51٪ خواتین انیمیا کا شکار ہیں، جس کی بنیادی وجہ ناقص غذائی معیار ہے۔

شہری کاری کا اثر:

شہری علاقوں میں خواتین زیادہ چکنائی اورچینی والی غذائیں استعمال کرتی ہیں، جس سے موٹاپے اور طرز زندگی سے منسلک بیماریوں کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

عالمی ادارہ صحت (WHO) کے مطابق، شہری خواتین دیہی خواتین کے مقابلے میں 30٪ زیادہ غیرصحت مند کھانے کی عادات اپناتی ہیں۔

غذائی معلومات کی کمی:

غذائی عادات سے متعلق غلط فہمیاں اور فیشن ڈائیٹس خواتین کے لیے صحت مند غذا کے تصور کو پیچیدہ بناتی ہیں۔

حل: علاج بالغذا کا تصور:

یونانی طب "علاج بالغذا" کی اہمیت پرزوردیتی ہے۔

تعلیم کی ضرورت: خواتین کوغذا کے علاجی فوائد کے بارے میں آگاہ کیاجائے۔

کمیونٹی سپورٹ: اقتصادی اور سماجی رکاوٹوں کے باوجود خواتین کو صحت مند فیصلے کرنے میں مدد فراہم کی جائے۔

ہارمونی توازن: متوازن غذا ہارمونی مسائل کوکم کرتی ہے۔

دائمی بیماریوں سے تحفظ: تغذیہ دل کی بیماریوں، ذیابیطس، اور دیگر مسائل کوروکنے میں مددگار ہے۔

ہنی صحت: اچھی تغذیہ تناؤ کوکم کرتی اورذہنی سکون فراہم کرتی ہے۔

معاشرتی اثرات:

صحت مند خواتین اپنے خاندان کی بہتر دیکھ بھال کرتی ہیں اورسماجی واقتصادی ترقی میں اہم کردارادا کرتی ہیں۔

اچھی تغذیہ معاشرتی صحت اورخوشحالی کی بنیاد ہے۔

پوشن ابھیان:

انیمیااوردیگرغذائی کمی کے خلاف مہم۔

ماں اور بچے کی صحت میں بہتری پرتوجہ۔

پردھان منتری ماتر ووندانایوجنا (PMMVY):

حاملہ اوردودھ پلانے والی خواتین کے لیے مالی امداد، تاکہ وہ صحت مند غذا کوترجیح دے سکیں۔

ان اسکیموں کی کارکردگی کا جائزہ لینا اور انھیں مزید موثر بنانا ضروری ہے تاکہ تغذیہ کی کمی کے مسائل کا مستقل حل فراہم کیاجاسکے۔

غذائی اجزااور ہارمونی توازن:

اومیگا-3 فیٹی ایسڈز: مچھلی، اخروٹ، اورالسی کے بیج ہارمونی توازن اورسوزش کوکم کرنے میں مددگار ہیں۔

میگنیشیم: پتوں والی سبزیاں تناؤ کوکم کرکے کورٹیسول کی سطح کومنظم کرتی ہیں۔

زنک: ہارمونی صحت کوسپورٹ کرتااورجسمانی افعال کوبہتر بناتا ہے۔

مثالی غذا کی اہمیت:

متوازن غذا جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے لازمی ہے۔

یونانی طب کے اصولوں کے مطابق خوراک کا استعمال ہارمونی صحت کو بحال رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

صحت مند غذا اور ہارمونی توازن:

متوازن غذا ہارمونی عدم توازن کوروکنے میں اہم کردارادا کرتی ہے، جواکثرخواتین میں پولی سسٹک اووری سنڈروم (PCOS)، تھائیرائیڈ کے مسائل، اورحیض کی بےقاعدگی جیسی حالتوں کا سبب بنتا ہے۔

غذائیت سے بھرپورغذا کی اہمیت

پروٹین اورفائبر: ہارمونی سطح کومتوازن رکھنے میں مددگار۔

صحت مند چکنائیاں: اومیگا-3 فیٹی ایسڈز ہارمونی افعال کوسپورٹ کرتے ہیں۔

ضروری وٹامنز اور معدنیات: جیسے زنک اور میگنیشیم، اینڈوکرائن عوارض کے خطرے کوکم کرتے ہیں۔صحیح غذائی انتخاب سے خواتین نہ صرف ہارمونی مسائل سے بچ سکتی ہیں بلکہ اینڈوکرائن صحت کوبھی بہتر

بنا سکتی ہیں۔

خواتین کی مختلف زندگی کے مراحل میں غذائی ضروریات

نوجوانی:

نشوونما کے لیے زیادہ آئرن اور کیلشیم۔

فوائد: ہڈیوں کی مضبوطی اور خون کی صحت۔

حمل:

ضروریات: فولک ایسڈ، پروٹین، اور آئرن کی بڑھتی ہوئی طلب۔

فوائد: جنین کی صحت مند نشوونما۔

سن یاس (Menopause)

ضروریات: کیلشیم اور وٹامن ڈی ہڈیوں کو مضبوط رکھنے کے لیے۔

فوائد: آسٹیوپوروسس کے خطرے میں کمی۔

اہم نکتہ:

ہر زندگی کا مرحلہ مختلف غذائی ضروریات پیش کرتا ہے۔ ان مراحل سے آگاہ رہنا خواتین کو صحیح غذائی فیصلے کرنے میں مدد دے سکتا ہے، جو ان کی صحت کو زندگی بھر بہتر رکھ سکتا ہے۔

ماں اور بچے کی صحت پر غذائی قلت کے اثرات

ماں پر اثرات:

غذائی قلت: ماں کی موت کے خطرے میں اضافہ۔

صحت کے مسائل: خون کی کمی اور کمزوری۔

بچے پر اثرات:

قبل از وقت پیدائش: غذائی قلت کے سبب جنین کی کمزور نشوونما ہوتی ہے۔

نشوونما کی تاخیر: بچے کی جسمانی اور ذہنی ترقی متاثر ہو سکتی ہے۔

حل کے اقدامات:

قبل از پیدائش دیکھ بھال ضروری ہے۔ خواتین کو متوازن غذا فراہم کرنی چاہیے۔

ایسے اقدامات کرنے چاہیے جو ماں اور بچے دونوں کے لیے مناسب غذائی سہولتوں کی ضمانت دیں۔

بیماریوں کی روک تھام:

قلبی امراض: اینٹی آکسیڈنٹس سے بھرپور غذا دل کی بیماریوں کو کم کرتی ہے۔

موٹاپا اور ذیابیطس: فائبر سے بھرپور غذا وزن اور بلڈ شوگر کو کنٹرول میں رکھتی ہے۔

علاجی کردار:

آسٹیوپوروسس: کیلشیم اور وٹامن ڈی سے ہڈیوں کی مضبوطی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

ہارمونی مسائل: اومیگا-3 اور زنک سے بھرپور غذا ہارمونی افعال کو بہتر بناتی ہے۔

مثال کے طور پر بحیرہ روم کی غذا قلبی صحت کے لیے مفید ہے۔

اختتامیہ:

تغذیہ کی بنیادی حیثیت: تغذیہ خواتین کی صحت کے ہر پہلو میں اہم ہے، چاہے وہ بیماری کی روک تھام ہو، حالت کا علاج ہو، یا زندگی کے معیار میں بہتری ہو۔

جامع نقطہ نظر:

یونانی طب کے اصولوں، جدید سائنسی تحقیق، اور انفرادی ضروریات کو یکجا کر کے خواتین کی صحت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

یونانی طب کا کردار:

یونانی طب غذا کے ذریعے بیماریوں کی روک تھام اور علاج کو ترجیح دیتی ہے، جسم کے اخلاط کے توازن کو بہتر بنا کر صحت کو فروغ دیتی ہے۔

متوازن اور غذائیت سے بھرپور غذا خواتین کو جسمانی، ذہنی، اور جذباتی طور پر مضبوط بناتی ہے جو ان کی زندگی کو صحت مند اور بااختیار بنانے میں معاون ہے۔

□□□

Dr. Sadia Zahid

301,United Apartment

B-28/6,Shaheen Bagh

Okhla, New Delhi-110025

drsadiazahid201@gmail.com

ارتباط

مباحثہ

عصر حاضر میں خواتین کے بعض امراض بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ خاص طور سے نوجوان عورتوں میں پولی سسٹک اوورین ڈزیز بہت عام ہے۔ موجودہ طرز زندگی اس کا ایک اہم سبب ہے۔ خواتین میں بانجھ پن کا ایک عام سبب یہ بیماری بھی ہے۔ اس لیے اگر خواتین اپنی طرز زندگی میں تبدیلی لے آئیں تو اس بیماری سے کافی حد تک تحفظ اور قابو پایا جاسکتا ہے۔ موجودہ دور میں خواتین میں دو سرطان (کینسر) بہت ہی عام ہیں۔ ہندوستان میں بچہ دانی کا کینسر (سروائکل کینسر) کافی عام ہے، اس کے بعد پستان کا کینسر دوسرے نمبر پر ہے۔ یہ دونوں ایسے کینسر ہیں اگر ان کی تشخیص شروعاتی مرحلہ میں ہو جائے تو ان کا علاج کافی اچھا ہوجاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ خواتین کی ان کینسر کے لیے اسکریننگ کی جائے اور خواتین کو ان دونوں کینسر کے شروعاتی علامات سے بیدار بھی کیا جائے۔ کچھ علامات ایسی ہوتی ہے جن کو اگر شروعات میں مریض کی جانچ کرلی جائے تو کینسر کی وقت پر تشخیص ہوجاتی ہے۔ اس لیے خاص طور سے ان دونوں کینسر کے بارے میں عام خواتین کو بیدار کرنا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح سے خواتین میں خون کی کمی بھی بہت عام ہے۔ خون کی کمی کا صحیح وقت پر پتہ لگا کر اس کا علاج اچھے سے کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خواتین میں کمزوری، تکان جیسی علامات ہونے پر ہیموگلوبن کی جانچ کرا کر اس کا صحیح وقت پر علاج کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح دوران حمل میں خون کی کمی بھی ایک اہم بیماری ہے۔ اس کے لیے بھی خواتین کو بیدار کرنا بہت ضروری ہے۔

اس طرح سے خواتین دنیا کے ہر شمارے میں ''صحت'' کا ایک موضوع ضرور رہنا چاہیے، تاکہ خواتین میں پائی جانے والی عام بیماریاں، مختلف قسم کے کینسرس سے عام خواتین کو بیدار کیا جاسکے۔ اس بات پر خاص طور سے دھیان دینا چاہیے کہ ایسے امراض کے بارے میں مضمون لکھے جائے جو عام ہوں اور جن امراض کی تشخیص شروعات میں اگر ہوجائے تو ان خطرناک امراض کا علاج صحیح وقت پر ہوجائے۔ مثلاً بچہ دانی، پستان کا کینسر وغیرہ۔ اس کے علاوہ خواتین میں ہونے والے جلدی امراض اور زینت سے متعلق امراض کو بھی شامل کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر احسان رؤف، میڈیکل آفیسر (یونانی) لکھنؤ

سلام مسنون

اگست 2024 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سرورق پر نظر ٹھہری۔ عنوان کی اوپری سطر نے توجہ مبذول کی۔ آدھی آبادی کے جذبات ۔۔۔ ترجمان میں سمجھتا ہوں ''نصف بہتر کے جذبات و احساسات کا

تر جمان'' ہوتو بہتر ہوگا۔ دوسرے اس کے مضامین تعلیم نسواں کے فروغ میں ساوتری بائی پھلے اور فاطمہ شیخ کا کردار'نسوانی کردار کا رمزشناس ،عورت کا مشرقی تصور۔۔۔۔شائشہ فاخری کے افسانوں میں حسیّت'' تانیثی ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔معلومات افزا بھی ہیں۔تانیثی ادب کی عکاس بھی ہیں۔تانیثی ادب،خواتین کے تمام مسائل اور ان کے متعلق تحریریں جگہ پاتی ہیں۔''خواتین دنیا'' کو تانیثی ادب کے لیے ہی مخصوص کیا جائے۔''بچوں کی دنیا'' طفل مرکوز تعلیم پر زور دیتا ہے تو اسی طرح''خواتین دنیا''خواتین مرکوز ہو۔ اس میں نسوانی آواز اور اس کے مسائل وحل'ان کے متعلق ہی تحریروں کی شمولیت ہو۔تانیثی ادب پیش کیا جائے۔چاہے وہ تحریر مرد کی ہو یا خواتین کی ساتھ ہی مضمون نگار کا پتہ اور موبائل نمبر،ضرور لکھیں تاکہ مضمون نگار سے کتب وغیرہ کے بارے میں معلومات کا حصول آسان ہو۔''خواتین اور سائنس'' کے گوشہ کا اشتہار اچھا قدم ہے۔ ''اردو دنیا اور بچوں کی دنیا'' میں بھی اس جانب توجہ مبذول کریں۔ تحریریں روشن رکھیں تاکہ پڑھنے میں ہمارے لیے آسانی ہو۔جیسا کہ ابھی ہیں۔قارئین اور مصنفین حضرات کے فون اٹھائیں اور جوابات سے ضرور نوازیں۔

قومی کونسل کے تینوں رسالے خارجی و باطنی اعتبار سے بہت خوبصورت اور بہت سی خوبیوں سے پُر ہوتے ہیں۔مصنفین بھی قابل مبارک باد ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ادارہ کی حفاظت فرمائیں۔یہ گلدستے اس دبستانِ اردو میں مہکتے رہیں۔

خادم اردو

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان ،روبرو مولانا آزاد کالج نیشنل کالونی، پلاٹ نمبر 34،اورنگ آباد،مہاراشٹر

فروری کے شمارے میں

یوم سائنس کی مناسبت سے ایک گوشہ

بعنوان

'خواتین اور سائنس'

شائع کیا جائے گا۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ 15 جنوری 2025 تک
اس موضوع کے تحت مضامین درج ذیل پتے پر ارسال فرمائیں۔

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000
ای میل: kduniya@ncpul.in، editor@ncpul.in

مطبوعات نسواں

خواتین دنیا میں مطبوعات نسواں کے عنوان سے ایک نیا کالم شروع کیا جا رہا ہے جس میں خواتین کی کتابوں پر تبصرے اور تجزیے شائع کیے جائیں گے۔

خواتین اپنی تازہ مطبوعات درج ذیل پتے پر ارسال فرمائیں۔

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

ترتیب وتدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

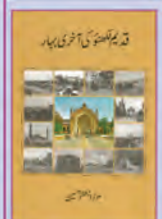

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

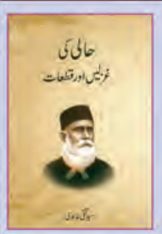

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जनवरी - २०२५वर्ष:९, अंक: १

Mahnama Khawateen Duniya Monthly January 2025, Vol.9, Issue: 1

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-01-2025
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

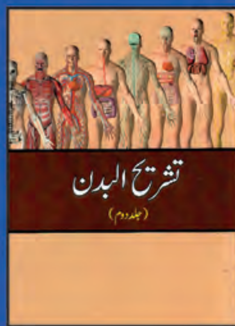

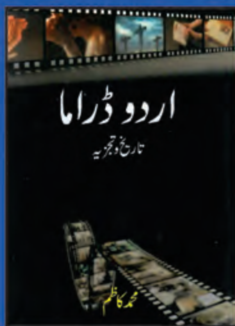

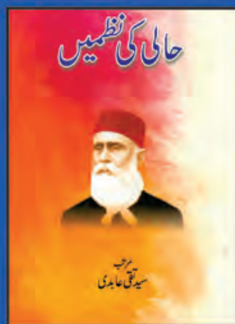

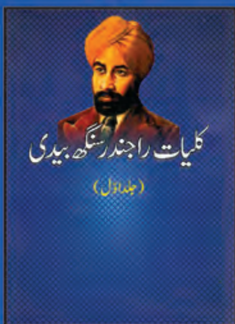

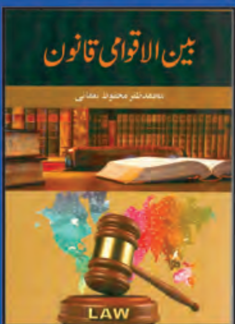

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025